مشرق و مغرب کی کہانیاں
مترجم
ممتاز شیریں
ترتیب وتدوین
پروفیسر ڈاکٹر تنظیم الفردوس

مشرق و مغرب
کی کہانیاں

Ebook By
Anis ul Hassah Shah

https://web.facebook.com/Shah.AnisulHassan/

https://wa.me/message/923142893816

مشرق و مغرب کی کہانیاں

مترجم

ممتاز شیریں

ترتیب و تدوین

پروفیسر ڈاکٹر تنظیم الفردوس

نیشنل بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد
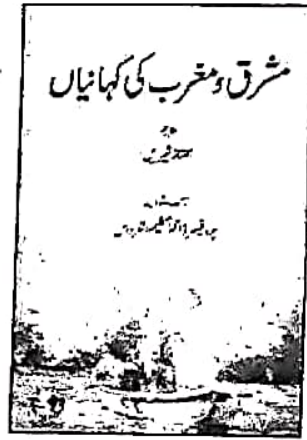
نگران : ڈاکٹر انعام الحق جاوید
مترجم : ممتاز شیریں
ترتیب و تدوین : پروفیسر ڈاکٹر تنظیم الفردوس

اشاعت : دسمبر، 2017ء
تعداد : 1000
کوڈ نمبر : GNU-666
آئی ایس بی این : 978-969-37-1051-9
طابع : سگما پریس اُردو بازار، راولپنڈی

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی مطبوعات کے بارے میں مزید معلومات کے لیے رابطہ:
ویب سائٹ http/www.nbf.org.pk یا فون 92-51-9261125
یا ای میل books@nbf.org.pk

فہرست

پیش لفظ

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی جانب سے نئی منصوبہ بندی کے تحت علم وادب، سائنس، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، اسلامیات، اخلاقیات، طب، حالاتِ حاضرہ، حکمت ودانائی، بچوں کے ادب اور تحقیق کے حوالے سے اہم موضوعات پر معلوماتی کتب کی اشاعت تسلسل سے جاری ہے۔ اس ضمن میں کوشش کی جاتی ہے کہ قارئین کے ذوقِ مطالعہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مفید اور معیاری کتابیں شائع کی جائیں۔ موجودہ کتاب ''مشرق ومغرب کی کہانیاں'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

بے شک ادب کی کوئی سرحد نہیں ہوتی لیکن ادیب کا کوئی نہ کوئی وطن ضرور ہوتا ہے اسی لیے تہذیبوں کے درمیان لین دین کا عمل جاری وساری رہتا ہے۔ ہر علاقے کا ادب اپنے علاقے کی تہذیب وتمدن کا عکاس ہوتا ہے۔ عالمی سطح پر تہذیبوں کے تنوع اور رنگارنگی سے جان کاری ضروری ہے کیونکہ اس جان کاری سے ان تہذیبوں کے اظہار کے منفرد سانچے بنتے آئے ہیں جن سے ہمیں ان کے ہاں جنم لینے والے افکار ونظریات اور رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔

مشرق ومغرب میں تراجم کی روایت بہت قدیم ہے۔ مغرب میں قدیم ترین ادبی شاہکار ''اوڈیسی'' کا ترجمہ ۲۵۰ ق۔م میں ''لیویوس'' نے کیا تھا جب کہ مشرق میں ترجمے کی روایت کا آغاز ۵۵۰ء میں سنسکرت کی کتاب ''ہتوپدیش'' کے ترجمے ''پنج تنتر'' سے ہوا۔ مسلمانوں میں خلیفہ مامون الرشید کا زمانہ تراجم کے حوالے سے نمایاں ہے۔ انھوں نے کئی یونانی کتب کے عربی میں تراجم کرائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک ادارہ ''دارالحکمت'' کے نام سے قائم کیا جہاں علما تصنیف وتالیف اور ترجمے کا کام سرانجام دیتے تھے۔ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ بھی یونانی تراجم کے باعث ہی ممکن ہوئی۔ اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے نیشنل بک فاؤنڈیشن نے تراجم

کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور موجودہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں مشرق ومغرب کی بہترین کہانیوں کے تراجم پیش کیے گئے ہیں۔ ممتاز شیریں نے یہ تراجم اُس وقت کیے تھے جب اُردو افسانے کو خود نئے اسالیب اور نئے زاویوں کی ضرورت تھی۔ محترمہ تنظیم الفردوس نے ''معیار'' ''ساقی'' اور دیگر تنظیم جیسے وقیع پرچوں میں چھپنے والی ان ''معیاری'' کہانیوں کو یکجا پیش کر کے ایک اہم کارنامہ سرانجام دیا ہے جس سے پڑھنے والے یقیناً مستفید ہوں گے۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید
(پرائڈ آف پرفارمینس)
مینیجنگ ڈائریکٹر

مشرق و مغرب کا افسانوی ادب

(اُردو میں ترجموں کی ایک منفرد مثال)

ممتاز شیریں کا شمار فکشن کے ان مترجمین میں ہوتا ہے جنھوں نے ترجمہ نگاری کے اصولوں اور قواعد وضوابط کا اظہار بہترین شعور کے ساتھ دو زاویوں سے کیا ہے، ایک تو ترجمے سے متعلق نقطۂ نظر کا اظہار عملی صورتوں میں کر کے اور دوسرے فنِ ترجمہ نگاری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے۔ بطور مترجم ان کی شخصیت کا عملی اظہار ''نیا دور'' کے اجراء کے ساتھ ہوا اور انھوں نے ''نیا دور'' میں مقامی و مغربی زبانوں کے افسانوں کے تراجم باقاعدگی کے ساتھ شائع کرنے شروع کیے۔ اُردو کے ابتدائی مراکز سے دور ہونے کی بنا پر ابتدا میں انھیں ترجمہ نگاروں کا تعاون حاصل نہیں تھا اس لیے ''نیا دور'' کے ابتدائی دور میں شائع ہونے والے اکثر افسانوی تراجم ممتاز شیریں نے خود کیے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ یقین تھا کہ مترجم کا کام انتہائی دیانت داری کا ہے۔ ان کے خیال میں اچھا ترجمہ وہ ہے کہ جو نہ تو اجنبی معلوم ہو اور نہ ہی مصنّف کی طبع زاد تصنیف محسوس ہونے لگے۔ ان کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ ترجمہ اصل سے کمتر نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی ترجمے کو اصل سے آگے بڑھانے کی کوشش پسندیدہ ہو سکتی ہے۔ ان کے خیال میں ''واقعی اچھا ترجمہ وہ ہوتا ہے جس میں نہ صرف اصل کی رُوح برقرار ہے بلکہ اس میں مصنّف کے اسلوب کا عکس اُتر آئے۔ (۱)

''نیا دور'' میں شائع ہونے والے ان کے تراجم اور بعد میں منظرِ عام پر آنے والے دیگر تخلیقی و تنقیدی کاموں نے انھیں ایک بڑی نقاد، اہم افسانہ نگار اور باصلاحیت مدیرہ ہونے کے علاوہ انگریزی اور مقامی زبانوں کی ایک اچھی مترجم بھی ثابت کر دیا۔ (۲) جیسا کہ ذکر ہوا ۱۹۴۴ء میں ''نیا دور'' کے اجراء کے بعد ہی سے اس میں مسلسل تراجم شائع ہوتے رہے۔ اس ضمن میں

ممتاز شیریں اور صمد شاہین کو نامور لکھنے والوں کا تعاون حاصل رہا۔ انھوں نے تراجم پر مبنی خاص نمبر بھی نکالنے کی روایت ڈالی۔ اس ضمن میں اختر انصاری کے نام ایک خط میں ان اکابرین کا تذکرہ کرتی ہیں جنھوں نے تراجم میں ان کی اعانت کی۔ اسی خط میں آگے چل کر وہ لکھتی ہیں کہ:

> ''اب ہماری ایک تجویز۔ ہم نمبر۱۰ ایک خاص نمبر کے طور پر نکال رہے ہیں۔ یہ بنگالی افسانہ نمبر ہوگا۔ اس میں دورِ جدید کے نمائندہ بنگالی افسانہ نگاروں کے بہت اچھے افسانوں کا انتخاب شائع ہوگا۔ انتخاب ہم نے کیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ ان کے ترجمے بھی مشہور اہلِ قلم سے کروائیں (یہ انگریزی میں ترجمہ شدہ افسانے ہیں) اب آپ سے بھی درخواست ہے کہ ان میں سے ایک کا ترجمہ عنایت کردیں۔''(۳)

اُردو کی اوّلین خاتون ادیبوں کے درمیان ممتاز شیریں کا یہ اختصاص بے حد نمایاں ہے کہ نہ صرف انھوں نے اوّلین افسانوی تراجم کے نمونے پیش کیے اور مختلف زبانوں سے افسانوں کے تراجم کی روایت قائم کرنے میں اہم کردار اَدا کیا بلکہ افسانوی تراجم کی فنی اور تکنیکی حیثیت پر بھی گفتگو کی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ''نیا دور'' کے ایک شمارے میں عزیز احمد کے مجموعے ''رقصِ ناتمام'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے انگریزی سے غیر ضروری طور پر متاثر ہونے والے انداز پر تنقید کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

> ''کبھی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ جملے اور پیراگراف ٹوٹ ٹوٹ کر، رُک رُک کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ انگریزی فقروں، انگریزی ترکیب اور انداز کے جملوں کا استعمال بھی اس رُکاوٹ کا باعث ہے...... اس طرح کی انگریزی ترکیب والے جملے اظہار میں بہت رُکاوٹ ڈالتے ہیں یا خالص انگریزی فقرے جیسے ''تم بالکل ناممکن ہو''، ''مسکرا کے محسوس کیا''، ''مہربانی کر کے''...... یا باتیں کرتے

ہوئے یہ اندازِ تخاطب......نوجوان آدمی Young man یا میرے
عزیز لڑکے My dear boy۔ یہ ٹھیک ہے کہ بولنے والے کردار
یورپین ہیں اور زیادہ حقیقی ٹچ دینے کے لیے عزیز احمد ان ہی کے
جملوں کو اُردو میں منتقل کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ اُردو میں نہیں
جچتے۔'' (۴)

ممتاز شیریں نے مغربی زبانوں سے جتنے تراجم کیے، بیشتر انگریزی کے وساطت سے کیے۔ ''نیا دور'' کے علاوہ ہم عصر جرائد میں بھی ان کے تراجم شائع ہوتے رہے۔ صمد شاہین صاحب کے بیان کے مطابق: ''انھوں نے ایک افسانہ براہ راست فرانسیسی زبان سے ''ریوالور'' کے نام سے بھی ترجمہ کیا تھا۔'' (۵)

مغربی افسانے کے تراجم سے ممتاز شیریں کے بے پناہ اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ اعتماد انھیں اس لیے حاصل تھا کہ وہ انگریزی زبان و ادب کی بہت اچھی طالب علم تھیں اور انھوں نے تخلیقی و تنقیدی نوعیت کے کئی اہم کام براہِ راست انگریزی زبان میں بھی کیے تھے (خیال رہے کہ انگریزی میں ان کے تنقیدی کاموں کا بڑا حصہ اب تک اشاعت سے محروم ہے)۔ زبان پر عبور اور انگریزی ادب کے گہرے مطالعے کے علاوہ مغربی ممالک کی سیر و سیاحت نے بھی ترجمہ نگاری کے فن میں انھیں اعتماد بخشا۔ جن زبانوں کے اکثر افسانے انھوں نے اُردو کے قالب میں ڈھالے، ان ممالک کی تہذیب و ثقافت اور زبان و اسلوب کی نفاست و باریکیوں سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھیں۔ اس لیے ترجموں میں وہ بالعموم اسقام سے پاک زبان استعمال کرتی تھیں۔ لفظوں کے پیچھے کارفرما جذبوں کی شدّت کو پوری قدرت سے بیان کرتی تھیں۔

انھوں نے اپنے کیے ہوئے تراجم میں اس امر کا بھرپور خیال رکھا ہے کہ ادبی فن پاروں کے تراجم میں روا رکھی جانے والی غلطیوں سے بچیں۔ انھوں نے ہندی، تلگو، مراٹھی، کنٹری، انگریزی، روسی، چینی، جرمنی، امریکی، نارویجن زبانوں سے کہانیوں کا ترجمہ کرنے کے علاوہ کامیو کے ناول ''اجنبی'' کا ترجمہ کرنا بھی شروع کر دیا تھا، لیکن اس وقت نامکمل چھوڑ دیا جب انھیں علم ہوا

کہ اس ناول کا ترجمہ کوئی اور صاحب کر چکے ہیں۔(٦)

تراجم کے ذیل میں ممتاز شیریں کا اہم کارنامہ ''درِ شہوار'' ہے۔ ممتاز شیریں کے فن اور کاموں کا جائزہ لیتے ہوئے کبھی بھی اس ترجمے کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس ترجمے کے ساتھ انھوں نے ستر صفحات پر مشتمل ایک وقیع مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ یہ مقدمہ بے حد معلوماتی اور پُرمغز ہے جس میں ممتاز شیریں نے جان اسٹین بک اور اس کے ہم عصر، ممتاز امریکی ناول نگاروں کی تخلیقات اور ادبی قد و قامت کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ انھوں نے امریکہ میں ناول نگاری کے فن، فروغ اور جدید امریکی ناول نگاری کے رُجحانات کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ زیرِ نظر تحریر چوں کہ ممتاز شیریں کے افسانوی تراجم کے جائزے تک محدود ہے لہٰذا ''درِ شہوار'' پر تفصیلی تبصرے کی گنجائش نہیں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ''ناول کے کردار، ماحول، زندگی اور گفتگو کا انداز ہمیں بالکل اجنبی معلوم نہیں ہوتے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ دُور دیس کی کہانی نہیں ہمارے ساحلی علاقوں پر بسنے والے ان مچھیروں کی زندگی کا بیان ہے جن کے بود و باش سے ہم واقف ہیں۔''(٧)

جیسا کہ ذکر ہوا ممتاز شیریں نے مقامی و غیر مقامی زبانوں سے افسانوں کو اُردو میں منتقل کیا۔ مغربی افسانوں کے اکثر ترجمے انھوں نے انگریزی کے توسط سے کیے لیکن بعض کہانیوں کے ترجمے براہِ راست اصل زبان سے بھی کیے اگرچہ ان کی تعداد کم ہے۔ ترجموں کے لیے ان کا انتخاب بتاتا ہے کہ انھوں نے مخصوص تصورات یا محدود ضروریات کے تحت یہ تراجم نہیں کیے۔ ان ترجموں کو محض مہم جوئی یا علمی و ادبی دُنیا میں متعارف ہونے کے لیے استعمال نہیں کیا۔ ان کے یہاں مغربی ادب کا انتخاب ان کی ذاتی پسند پر ہے اور اس کے پیچھے ان کا وسیع مطالعہ، شوق اور کچھ جاننے کا جذبہ کارفرما ہے۔ اپنے عہد کے نوجوانوں کی طرح مغربی ادب کے بارے میں تجسس ان کے لیے شدید ذہنی ضرورت تھا۔ اسی لیے اپنے عہد کے بعض اہم مترجمین کی طرح ممتاز شیریں کے کیے ہوئے تراجم محض تفریحِ طبع کا باعث نہیں بلکہ سوچنے کے لیے سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔

''ہم عصر شاہکار جرمن افسانے'' نامی مجموعہ پہلی مرتبہ جرمن زبان میں مشہور جرمن نقاد

''وولف گا نگ لانگن بورشرٹ'' اور ''سیگرڈ کا ہلے'' نے مرتب کیا تھا۔ یہ مجموعہ ''ہارسٹ ارڈمن ورلاگ''، ہیرغلب (جرمنی) اور ''باسل'' (سوئیزر لینڈ) نے شائع کیا تھا۔ فیروز سنز نے اسی مجموعے کے سترہ افسانے اُردو میں ترجمہ کروا کے ''ہارسٹ ارڈمن ورلاگ'' کے تعاون سے متذکرہ بالا مجموعہ شائع کیا۔ اُردو میں اس کا دیباچہ ممتاز حسن نے تحریر کیا جب کہ سیگرڈ کا ہلے کے تحریر کردہ پیش لفظ کو اظہر الدین احمد نے اُردو کے قالب میں ڈھالا۔

جرمن کلاسیکی ادب کے اُردو تراجموں کی روایت بیسویں صدی کے اوائل ہی سے نظر آتی ہے لیکن بیسویں صدی کے نصف آخر میں سامنے آمنے والے جرمن افسانے کی روش کلاسیکی افسانے کی روایت سے بالکل مختلف تھی۔ بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں جرمن قوم سخت کرب واذیت کے مراحل سے گزری۔ اس عرصے میں اس قوم نے اپنی بہادری کا سکہ ساری دُنیا پر بٹھایا۔ حتمی کامیابی اس قوم کے حصے میں نہ آسکی لیکن ساری دُنیا اس سے شکست کھاتے کھاتے بچی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جو ظلم وستم ان پر کیے گئے، ہر طبقے اور گروہ کے افراد اس سے متاثر ہوئے۔ یہی تاثر اہلِ قلم کی تحریروں میں منقلب ہوا۔

ایک جانب وہ عمومی اثرات تھے جو جنگ وجدال اور مابعد اثرات کی وجہ سے لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ دوسری جانب ایک اعصاب شکن مرحلہ جس کے خصوصی اثرات سے یہ پوری قوم گزری۔ اس تناظر میں جب ہم مذکورہ مجموعے کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ دِکھائی دیتا ہے کہ اس کے بیشتر لکھنے والے پہلی جنگِ عظیم کے دوران یا جنگ کے بعد پیدا ہوئے۔ جنگ کے بعد جو صورتِ حال جرمنی میں رُونما ہوئی اس میں نئی نسل کو شروع ہی سے اپنے ملک کی تباہی کے علاوہ سختی، افلاس اور انسانی زندگی کی بےقدری کا تجربہ شدت کے ساتھ ہوا۔ یہ وہ نسل جس سے زندگی کی خوشیاں چھین لی گئی تھیں انھیں آنے والے کل کا بھی یقین نہیں تھا۔ یہ نسل ہٹلر کے تصورات سے بےزار تھی لہٰذا نازی ازم کی شکست ان کے لیے ایک نوع کے اطمینان کا باعث بنی مگر دورِ استبداد کی طوالت نئی زندگی کے آغاز کے لیے معاون ثابت نہ ہوسکی۔ اُمید کی وہ کرن جو ادب میں رجائیت پسندانہ رویّوں کی نمائندگی کیا کرتی ہے، یہاں ناپید تھی۔ سیگرڈ کا ہلے کے لفظوں میں:

''۱۹۴۵ء میں جرمنی ہی کے نہیں، جرمن ادب کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے...... ساری دُنیا جرمنوں پر انسان دُشمنی کا الزام لگا رہی تھی۔ لکھنے والوں کا اپنی زبان پر سے اعتماد اُٹھ گیا تھا۔ ہیرو، عزت، مادرِ وطن، وفاداری، خون، نسل، لوگ، فرماں برداری قسم کے لفظ اب کیسے استعمال ہو سکتے تھے؟ پہلی عالمی جنگ کے بعد اقتصادی بدحالی اور شکست کے دوران میں ایک بخار زدہ ادبی سرگرمی نے جنم لے لیا تھا...... دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہر چیز مختلف تھی۔ چارسُو مکمل بے حسی کا راج تھا۔ پڑھے لکھوں میں اپنے ثقافتی ورثے سے تغافل اور ادبی روایات سے چھٹکارا پانے کا رُجحان پیدا ہو چلا تھا۔ نئے دانشور بیم ورجا میں لٹکے ہوئے ثقافتی طور پر ایک نہایت ہی جھلسی ہوئی دُنیا کی باتیں کرتے تھے۔'' (۸)

مذکورہ بالا مجموعے کے تین افسانوں کا اُردو ترجمہ ممتاز شیریں نے ''موٹی بچی''، ''سبز جیکٹ'' اور ''بھوت'' کے نام سے کیا۔ یہ تینوں ترجمے انھوں نے انگریزی زبان کے وساطت سے کیے۔ ''موٹی بچی'' نامی افسانہ ''ماری لوئیزے کاشنز'' کا لکھا ہوا ہے۔

Kaschnitz, Marie Luise ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئی اور ۱۹۷۴ء میں فوت ہوئی۔ وہ ایک معزز گھرانے کی بیٹی اور ایک Baron کی بیوی تھی جو آرکیالوجی کا پروفیسر تھا۔ اس کے شوہر کی علمی مصروفیات نے ماری کو کلاسیکی روایات و تصورات سے آگہی بخشی۔ دونوں عظیم جنگوں کے درمیانی عرصے میں اس نے دو ناول لکھے۔ یہ دونوں ناول جو ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۹ء میں تحریر کیے گئے تھے رُومانی موضوعات پر مبنی اور سوانحی انداز کے تھے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد وہ ایک ایسی شاعرہ کے طور پر اُبھری جو عیسائی تصوارت کو عصرِ حاضر کی ضروریات سے جوڑنے کی خواہش مند ہے۔ اس نے شاعری کے لیے روایتی ہیئتوں کو ہی اپنایا لیکن شعر گوئی کا ایک مخصوص آہنگ بنانے میں کامیاب رہی۔ اس کے شعری مجموعے

۱۹۴۷ء، ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۷ء میں سامنے آئے۔ ۱۹۶۲ء میں اپنے شوہر کے انتقال کے موقع پر اس نے تاثراتی نظموں کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا۔

اس کے علاوہ ماری نے اپنی بیانیہ کہانیوں کی وجہ سے بھی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۶۰ء میں اس کی کہانیوں کا مجموعہ شائع ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں منظرِ عام پر آنے والا اس کا افسانوی مجموعہ انفرادی خصوصیات کا حامل ہے جس میں سوانحی اسلوب کے ساتھ ساتھ شاعرانہ لہجے کی آمیزش بھی شامل ہے۔ ۱۹۶۸ء میں اس کا ایک اور افسانوی مجموعہ شائع ہوا۔ ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۵ء میں اس کے تخیلاتی انداز کے مضامین کے دو مجموعے سامنے آئے۔ جب کہ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۷۶ء میں اس کی خودنوشتیں منظرِ عام پر آئیں۔ (۹)

''موٹی بچی'' نامی ماری کے افسانے کا موضوع خودشناسی ہے۔ یہ افسانہ مترجم کی لفظیات کی مدد سے اپنے رمزیہ انداز کے باوجود ایک اعلیٰ درجے کی مقامی تصوراتی فضا تشکیل دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تحیّر اور کشمکش کے جس ماحول سے افسانے کی اُٹھان ہوتی ہے وہ کسی مرحلے پر ٹوٹنے نہیں پاتا۔ جب کہانی کی راوی موٹی لڑکی کو دیکھتی ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اس سے مانوس ہے پھر فوراً ہی اسے ''محسوس ہوا نہیں میں اس سے مانوس نہیں ہوں۔ وہ اجنبی ہے۔ بلکہ اس کے یوں چپکے چلے آنے سے مجھے ڈر سا لگا۔'' (۱۰)

رفتہ رفتہ پوری کہانی خود احتسابی کا ایک مرحلہ وار سلسلہ بن جاتی ہے۔ دوپہر سے شام کا جھٹپٹا پھیل جاتا ہے۔ موٹی بچی، خوبصورت، مستعد اور چست و چالاک بہن سے مسابقت میں پیچھے رہ جانے کے خوف میں مبتلا تھی اور اپنے وجود کا اعتماد کھوتی جا رہی تھی، اچانک سامنے کھڑی موت نے اس کے وجود کا تاثر ہی تبدیل کر دیا۔ بددلی اور بے حسی کی تاریکی، عزم اور ارادے کی روشنی سے بدل گئی...... لیکن قاری کے لیے یہ مرحلہ چونکانے والا نہیں بلکہ قاری اس وقت بھی نہیں چونکتا جب کہانی کی راوی یہ بتاتی ہے:

> ''میں ریلنگز پر جھکی اس کے سفید چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی اور پانی کے اندر سے وہ چہرہ میری طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ میرا اپنا عکس ہو۔'' (۱۱)

کہانی کی راوی اس بچّی کی مدد تو نہ کر سکی لیکن اس اطمینان کے ساتھ اس مقام سے لوٹتی ہے کہ اب بچّی کو مدد کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ اب کہانی کی راوی اس بچّی کو اچھی طرح پہچان چکی تھی...... چونکانے کے لیے بات کو یہاں پر بھی ختم کیا جا سکتا تھا لیکن مترجم افسانہ نگار کا ساتھ دیتے ہوئے اس بیان تک پہنچ جاتی ہیں:

> ''ایک پرانی تصویر نکل آئی جس میں ایک بچّی پرانے فیشن کا اُونچے کالروں والا سفید اُدنی کوٹ پہنے تھی۔ اس کی آنکھیں جھیل کے پانی کی طرح شفاف تھیں اور وہ بہت موٹی تھی...... یہ میری اپنی تصویر تھی۔''(۱۲)

حالاں کہ مترجم نے کسی بھی جگہ ماحول یا کرداروں کو تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی اس کے باوجود قاری اجنبیت کے احساس کے بغیر کہانی کے بہاؤ میں بہتا چلا جاتا ہے۔ یقیناً اس کی رفتار اسلوب اور بیان کی خوبی میں پوشیدہ ہے۔ نامانوس جغرافیائی اور ثقافتی اشاروں کے باوجود یہ ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد افسانہ معلوم ہوتا ہے۔

نئے جرمن معاشرے کے تناظر میں ماری نے اس افسانے میں لفظی در و بست سے ایک علامتی فضا پیدا کر دی ہے۔ اس کی اکثر کہانیاں خودنوشت کا سا انداز رکھتی ہیں یہی انداز اس افسانے میں بھی نمایاں ہے۔ اس کے باوجود ''خندق''، ''پانی''، ''آئینہ'' اور اس طرح کے کئی الفاظ ایک جانب تحت الشعور میں پوشیدہ خیال کی گم شدہ دُنیا کی بازگشت معلوم ہوتے ہیں اور دوسری جانب اس قسم کا اسلوب جرمن کلاسیکی روایت کو جدید دور سے بھی ملاتا ہے۔ اس افسانے کی سب سے اہم خوبی جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے یہی ہے کہ قاری آخر تک اس نتیجے پر نہیں پہنچ پاتا کہ یہ ایک علامتی افسانہ ہے اور سونے جاگنے کے درمیانی عرصے میں وقوع پذیر ہوا ہے۔

اسی مجموعے میں گرڈ گیسر کا افسانہ بھی شامل ہے جسے ممتاز شیریں نے ''سبز جیکٹ'' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ Gaiser, Gerd ۱۹۰۸ء میں ورٹمبرگ کے ایک پادری کے گھر پیدا ہوا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک مسلسل جنگی پائلٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اٹلی کے محاذ پر

۱۹۴۵ء میں قید ہو گیا۔ جنگ سے قبل آرٹ کی تعلیم حاصل کر چکا تھا، لہٰذا جرمنی واپس آ کر مصوری کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۴۹ء میں رٹلنگن Reutlingen میں آرٹ کا لیکچرر مقرر ہوا۔

گیسر کی شناخت بطور کہانی کار ہوتی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں شائع ہونے والا اس کا ناول محاذ سے واپس آنے والے ایک فوجی کی کہانی ہے۔ اس ناول میں نہ صرف فوجی کی زندگی پر توجہ مرکوز کی گئی ہے بلکہ اس وقت کے جرمنی کی عمومی انحطاطی صورتِ حال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک اور ناول میں اس نے جرمنی اور اسکنڈے نیویا کے ہوائی محاذ پر جنگی مہمات میں حصہ لینے والے فائٹر گروہوں کی شجاعت کی کہانی بیان کی۔ اپنی ایک اور کتاب میں اس نے تیس ۳۰ یک شخصی ڈراموں Monologues کی مدد سے معاشرے کی سڑاند کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تیس یک شخصی ڈرامے اختتام پر ایک مخصوص اصطلاحی عمل کے ذریعے جُڑ جاتے ہیں جس کی وجہ سے پوری کتاب کا مجموعی تاثر یکساں رہتا ہے۔

گیسر نے جرمن ادب میں بے شمار ایسی کہانیوں کا اضافہ کیا ہے جو پُراثر اور پُرمغز ہونے کے علاوہ اسلوب کی روانی میں بھی بے مثال ہیں۔ یہ کہانیاں اپنے گتھے ہوئے انداز کی بنا پر خصوصی معنویت کی حامل ہو جاتی ہیں۔ اس کا ایک افسانوی مجموعہ ۱۹۶۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ عصری بنیاد کی سیاسی وجوہات کی بنا پر تقسیم اس کے افسانوں کا تنقیدی معیار بن جاتا ہے۔ اس کا دوسرا افسانوی مجموعہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ (۱۳)

''سبز جیکٹ'' کی کہانی کا مرکزی کردار جنگ کے بعد نشو و نما پانے والی نسل کی نمائندہ ہے جس کے سامنے جرمنی کی زندگی کی کلاسیکی روایات موجود نہیں۔ اس کی ماں اپنی نوجوان بیٹی کو تین اولادوں کی نگہبانی سونپ کر فوت ہو چکی ہے اور یہ کردار قدیم اور کلاسیکی روایات کو جمالیاتی اقدار کے نئے رویّوں اور تصورات میں منقلب کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔

بھائیوں اور چھوٹی بہن کی دیکھ بھال کرتے کرتے ثریا ''رئیس'' کہلانے لگی ہے۔ ادھیڑ عمری اس کی پہچان بنتی جا رہی ہے۔ ایک جانب بھائیوں کی زبان سے راٹھے کا خطاب اس کے لیے سوہانِ رُوح ہے تو دوسری جانب ''ونی'' یعنی اس کی چھوٹی بہن کا نکھرتا ہوا شباب ثریا کے

جذبات کے لیے مستقل ہیجان بن چکا تھا۔ حالات اور عمر نے اسے مستقل مزاج اور مستحکم خیالات کا مالک بنادیا ہے لیکن اس کے ناکارہ اور سست الوجود بھائیوں نے اسے محض اس لیے ''نیوٹر'' قرار دے دیا ہے کہ وہ ان کو تنبیہ کرتی رہتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح ثریا نے یہ صبر آزما دن بھی گزار لیے۔ قدیم وجدید زندگی کے دوراہے پر کھڑی یہ بہن اپنی ذات میں اقدار کی حفاظت کے لیے کوشاں تھی۔ چھوٹی بہن اپنے انداز واطوار کی بنا پر اس کے لیے ناپسندیدہ نہیں تھی۔ ہنستی بولتی چہچہاتی لڑکی اس گھر کی رونق تھی۔

مسلسل کام کر کے وہ ایک مستحکم مالی پوزیشن اور باوقار سماجی حیثیت کی مالک بن چکی ہے لیکن زندگی ہیجان کا نیا رُخ سامنے لے آتی ہے۔ اگرچہ وہ اپنی چھوٹی بہن کی تعلیم اور ذوق کی تسکین کے لیے روپیہ پیسہ بھی خرچ کرتی ہے لیکن ایک دم یہ احساس اسے ستانے لگتا ہے کہ اکثر ملنے والے بن بلائے آجاتے ہیں اور ونی کے لیے زیادہ تپاک ظاہر کرتے ہیں اور ونی بھی ان ملنے والوں کے لیے پُرجوش ہے۔ ضبط کی تمام تر کوشش کے باوجود ثریا ایسے مواقع پر اپنے لہجے کا توازن کھو بیٹھتی ہے۔

عدم توازن کے ایک ایسے ہی مرحلے پر اچانک وہ عجیب واقعہ رُونما ہو جاتا ہے جب ایک ہرن کے کھال سے بنی ہوئی خوبصورت مخملی جیکٹ سامنے آتی ہے۔ ثریا کے ذہن کی پیچیدگی اچانک اس کے مقابل آجاتی ہے جب سیلز گرل جیکٹ بیچنے کے لیے مصر ہو جاتی ہے۔ ثریا تیار نہیں ہوتی تو وہ ونی سے درخواست کرتی ہے کہ یہ جیکٹ پہن کر دیکھ لے۔ ثریا اپنے مخصوص لہجے میں بہن کو جیکٹ خریدنے سے روک دیتی ہے۔ یہاں سے بہن کے ذہن میں بھی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی پیچیدگی کے نتیجے میں وہ واقعہ رُونما ہو جاتا ہے جس نے ثریا کی نیک نامی پر سوالیہ نشان قائم کر دیا۔

جب وہ اپنا کوٹ واپس لینے کے لیے دکان میں داخل ہوئی تو مخملی جیکٹ دیکھ کر اس کے دل میں خیال آیا کہ باہر گاڑی میں بیٹھی بہن کو کیا خبر کہ دکان بند ہو چکی ہے چل کر اسے دِکھاؤں گی کہ میں نے یہ خرید لی ہے اس طرح شاید وہ کبیدگی دُور ہو جائے جو دونوں بہنوں میں پیدا ہو چکی

ہے۔اُدھر وِنی کی نظر اچانک اس شخص پر پڑتی ہے جس کی وجہ سے بڑی بہن نے اس کی توہین کی تھی، لیکن وہ سڑک کی دوسری جانب تھا، وہ یہ بھول گئی کہ اس کے پاس گاڑی کے کاغذات نہیں ہیں۔اس طرح آگے بڑھنے کی کوشش میں اس کا چالان ہو جاتا ہے جب کہ صحیح جگہ پر گاڑی نہ ہونے کی بنا پر ٹریسا جیکٹ چوری کرنے کے الزام میں پکڑی جاتی ہے۔

یہاں سے ٹریسا کی کشمکش کا وہ مرحلہ شروع ہوتا ہے جو کہانی کا نقطۂ عروج ہے اور یہ نقطۂ عروج ہی دراصل پوری کہانی پر محیط ہے۔پولیس افسر نے ٹریسا کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی لیکن ٹریسا کے لیے اس کی نوکری، سماجی مرتبے اور لوگوں کے درمیان قائم عزت پر سوالیہ نشان قائم ہو گیا۔کشمکش کے ان لمحوں سے نکلنے کا طریقۂ کار یہی تھا کہ چوری کی ہوئی چیز کی قیمت اور اسی کے مساوی رقم چندے کے لیے اور بغیر کسی رپورٹ یا تشہیری کے گلوخلاصی......ٹریسا کو نہ چاہنے کے باوجود یہی راستہ اختیار کرنا پڑا، لیکن ذہنی پیچیدگی کا عمل یہیں ختم نہیں ہوتا۔ٹریسا خریدی ہوئی جیکٹ چندے کی رقم کے بدلے عطیہ کرنے پر اصرار کرتی ہے۔یہ مرحلہ بھی طے ہو جاتا ہے اور کوئی اسکینڈل نہیں بنتا۔وِنی کے چالان کی رقم بھی اَدا کر دیتی ہے اور وِنی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سارا وقت ٹریسا نے کہاں اور کیسے گزارا؟

ٹریسا کی باطنی کشمکش اسے دُور دراز کے کسی شہر میں اپنا تبادلہ کروانے پر مجبور کر دیتی ہے۔اس کا ادارہ اور اس کے ساتھی ٹریسا کی کارکردگی سے بے حد خوش تھے لیکن جس جگہ اسے جانا تھا وہ بھی بہت اچھی تھی اس لیے اسے اجازت مل گئی۔اس کی رُخصت کے موقع پر اس کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی گئی اور مختلف قسم کے کھیل کھیلے گئے۔جب ٹریسا نے اپنا انعام وصول کیا تو وہی سبز، مخملی، ہرن کے کھال کی بنی ہوئی خوبصورت جیکٹ تھی۔خود پہننے کے بجائے ایک خوبصورت بہانے سے وہ اسے اپنی چھوٹی بہن کے حوالے کر دیتی ہے:

''اگر چہ پہلے تم اسے پہن کر دیکھ ہی چکی ہو؟'' (۱۴)

پورے افسانے میں ایک مخصوص ذہنی رو کا عمل دخل نمایاں ہے۔واقعات اس ذہنی رو کے سہارے آگے بڑھتے ہیں لیکن قاری کو کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کسی مانوس فضا سے باہر نکل

آیا ہو۔ اصل متن کی اس فضا کو مترجم نے بڑی خوبی سے برقرار رکھا ہے۔ زبان کی روانی کسی جگہ قاری کے ذہن کے لیے ترسیلِ مفہوم میں رُکاوٹ نہیں بنتی۔

کہانی کے بین السطور میں جو بات بہت گہرائی میں ہے وہی بات دراصل کہانی کا کلائمکس بنتی ہے۔ یعنی دونوں بہنوں کے درمیان رقیبانہ کشمکش کا ایک بڑا انسانی اور فطری جذبہ کارفرما ہے۔ اس کیفیت کا اظہار کئی مقامات پر ہوتا ہے۔ جب ٹریسا، ونی کو فائلنر کے آنے کی خبر دیتی ہے لیکن ونی کی بے ساختہ خوشی اس کے لیے تکلیف کا سبب بنتی ہے۔ اسے اس امر پر بھی حیرت ہے کہ آخر لوگ اب اس کے گھر آنے اور ملاقاتوں پر اس قدر اصرار کیوں کرنے لگے ہیں۔ یہی زیریں جذبہ اس وقت بھی نمایاں ہوتا دِکھائی دیتا ہے جب وہ چوری کی جیکٹ اپنے کوٹ کے اندر چھپا کر سڑک پر آنا چاہتی ہے اور فائلنر ہاتھ ہلاتا دِکھائی دیتا ہے۔ افسانہ نگار نے فائلنر کے اس عمل کو ونی کے ذیل میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ونی کو دیکھ کر فائلنر نے ہاتھ ہلا دیا، ونی یہ سوچ کر گاڑی آگے بڑھا لے جاتی ہے کہ چل کر اس سے پوچھنا چاہیے کہ اس روز گھر پر وہ کس سے ملنے آیا تھا۔

دراصل جذبات میں پیدا ہونے والا رقابت کا یہ جذبہ کسی مرحلے پر ان دونوں میں سے کسی کے لیے نقصان دہ ثابت نہ ہو سکا اور اس کی بنیادی وجہ بڑی بہن ٹریسا کی ضبط وتحمل کی عادت تھی جو اب اس کی شخصیت کا حصہ بن چکی ہے۔ اسی لیے جب وہ سپراسٹور سے نکلتی ہوئی فائلنر کو دیکھتی ہے جو اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا ہے تو وہ چھوٹی بہن کی دل شکنی کے خیال سے واپس اندر چلی جاتی ہے۔ اس مرحلے پر اگر وہ اندر نہ جاتی تو جیکٹ کی چوری میں اس کے پکڑے جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔

جنگِ عظیم دوم کے بعد جرمنی کی شہری زندگی میں اقدارِ عالیہ کی جو ٹوٹ پھوٹ اور انقلاب انگیز کشمکش جاری تھی اسی تناظر میں یہ افسانہ ایک مکمل علامت بنتا ہوا دِکھائی دیتا ہے۔ علامت نگاری کے اس عمل کو مصنف نے جس طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے مترجم بھی اس میں پیچھے نہ رہیں۔ لفظوں کا دروبست جو جرمن سے انگریزی اور انگریزی سے اُردو میں منتقل ہوا وہ ایک باکمال

اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے۔ عام قاری شاید افسانے کی علامتی معنویت تک نہ پہنچ سکے لیکن نفسِ انسانی کی پیچیدہ گہرائیوں سے آگاہ ضرور ہوجاتا ہے۔ انسانی نفس کی تہہ دار اُلجھنوں سے ممتاز شیریں کو اپنے افسانوں میں دلچسپی تھی اسی لیے اس کہانی کا ترجمہ کرتے ہوئے انھیں اسی قسم کی تہہ دار لیکن معصوم اُلجھنوں نے ایک عمدہ ترجمہ کرنے میں مدد دی۔ اُلجھنوں کی معصوم تہہ داری کا اندازہ اس جملہ سے لگایئے:

"تمھیں اس کا یقین ہے کہ وہ تمھارے لیے آیا تھا؟" (۱۵)

یہ کہہ کر ٹریسا نے ونی کو چیلنج نہ کیا ہوتا تو ونی اسی جگہ کار میں بیٹھی رہتی۔ وہ فالکنر کی اتنی پرواہ نہ کرتی بلکہ وہیں کار میں بیٹھی اس کا انتظار کرتی۔ فالکنر جو اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا، خود ہی سڑک پار کر کے اس کے پاس آتا اور پھر وہ اطمینان سے بیٹھی اس سے خوش گپیاں کرتی ہوئی اپنی بہن کا انتظار کرتی لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ونی بے چین ہوجاتی ہے، وہ نوجوان ہے، بہت جلد اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ٹریسا پختہ کار ہے، سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتی ہے۔ چوری کے معاملے میں اگرچہ اس کا کوئی اسکینڈل نہیں بنا لیکن:

> "اس کے دفتر میں سب حیران رہ جاتے ہیں جب وہ اپنا استعفا پیش کرتی ہے اور دوسری جگہ کے لیے اپنی خدمات پیش کرتی ہے جو ابھی خالی ہوئی ہے۔ "مجھے آب و ہوا کی تبدیلی کی ضرورت ہے" ٹریسا کہتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہوگی، لوگ اس کی بات مان لیتے ہیں۔" (۱۶)

مجموعی طور پر پورے افسانے میں روانی اور اسلوب کی شگفتگی نمایاں ہے۔ ذہنی یا نفسیاتی اُتار چڑھاؤ کے کسی مرحلے پر بھی مترجم کو اظہار کی دقت کا سامنا نہیں ہے۔ اجنبی پس منظر اور رُجحانات کے نئے پن کے باوجود وہ افسانے کی رُوح کو منتقل کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔ ممتاز شیریں کے لیے اس مرحلے سے گزرنا مشکل نہیں ہے اس لیے کہ انھوں نے نہ صرف مغربی افسانے اور مغرب میں افسانے کی تنقید کا بھرپور مطالعہ کر رکھا تھا بلکہ وہ مغرب کے بدلتے ہوئے

سیاسی، اقتصادی اور سماجی ڈھانچے کا بھی اچھا شعور رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقدار اور جذبات، دونوں سطحوں پر کشمکش کو پیش کرنے میں ممتاز شیریں کو کوئی دُشواری نہیں ہوئی۔

Schnurre, Wolf Dietrich (والف ڈیٹرش شینرے) ۱۹۲۰ء میں فرینکفرٹ میں پیدا ہوا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک مسلسل جنگ میں خدمات سرانجام دیتا رہا لیکن اس کے بعد ڈرامائی طور پر ایک نقاد اور مصنّف کے طور پر اُبھر کر سامنے آیا۔ گروپ ۴۷ کے شریک معماروں میں سے ایک تھا۔ لیکن ۱۹۵۱ء میں اس نے یہ گروپ چھوڑ دیا۔ ایک اعتبار سے وہ انتہاپسند رُجحانات کا حامل مصنّف تھا جس کی کہانیوں کا بنیادی میلان یا طبعی رُجحان اشیا، افراد اور رویّوں کی مضحک، بھدی یا بے جوڑ اجزا کی نشاندہی پر مبنی تھا۔ اس کے لکھے ہوئے بے شمار مختصر افسانے اور طنزیہ کہانیاں انفرادی طور پر بھی شائع ہوتی رہی ہیں اور ان کہانیوں کے کئی مجموعے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران سامنے آئے۔ پچاسویں دہائی کے اواخر میں وہ ایک ناول نگار کی حیثیت سے بھی اُبھرا۔ (۱۷) ''ہم عصر جرمن شاہکار افسانے'' میں اس کے ایک افسانے کا ترجمہ ممتاز شیریں نے ''بھوت'' کے نام سے کیا ہے۔

یہ ایک ایسے جوڑے کی کہانی ہے جس کی بیس سالہ رفاقت اس وقت ٹوٹنے لگتی ہے جب جنگ کے بعد تقسیم شدہ شہر میں رہتے رہتے افسانے کی نسوانی کردار ''ایلسے'' بیزار ہو چکی ہے۔ مشرقی برلن کی شکستگی، نظام کی جبریت اس کے حواسوں پر چھا چکی ہے۔ لہٰذا وہ یہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ اسے مغربی برلن کی چمکتی دَمکتی زندگی سے بھرپور فضاؤں میں ہی سکھ ملے گا۔ جانے کا ارادہ پختہ، سوٹ کیس تیار، فیصلہ آخری اور قطعی ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ پر حیران ہے۔

> ''وہ چاہتی تھی کہ اپنے نئے فیصلے پر کچھ صدمہ تو محسوس کرے، یا اس کے رونگٹے ہی کھڑے ہو جائیں، لیکن اس کی نبض بھی تیز نہ ہوئی...... حتیٰ کہ مغربی برلن جا کر ایک نئی زندگی شروع کرنے کے احساس تک سے اُسے کوئی خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اپنے تخیل میں یہ ساری باتیں اتنی مرتبہ دہرا چکی تھی کہ اب کوئی ہیجانی کیفیت باقی نہ رہی تھی۔'' (۱۸)

عدم ہیجان اور بے حسی کا یہ عالم تھا کہ والٹر یعنی رفیقِ حیات کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کے لیے آمادہ نہ ہوئی۔ والٹر کہتا ہے کہ جگہ کی بے رونقی اور ماحول کی یکسانیت کے باوجود اپنے علاقے کے لوگوں کے بارے میں سوچو، لیکن وہ ان لوگوں کے بارے میں کچھ سوچنے کے لیے تیار نہیں جو ہر وقت ایک دوسرے سے مشکوک رہتے ہیں، نہ ہنستے ہیں نہ مسکراتے ہیں، چیزوں، اشیا اور پیسوں کے معاملے میں جز رس ہیں۔ شہر کی بے رنگی، اُجاڑ پن اور درشتی ان لوگوں کے چہروں سے نمایاں ہے۔ والٹر کی رائے شہر اور لوگوں کے بارے میں مختلف نہیں لیکن ابھی تک اس کے وجود میں اس کے شہر کا مثالیہ زندہ ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ان خاموش، اُونگھتے اور ایک دوسرے سے بیزار رہنے والے لوگوں کے اندر کوئی ایسی مشترکہ خواہش موجود ہے جو انھیں متحد اور یکجا رکھتی ہے۔ والٹر کا خیال یہ بھی ہے کہ اگر حالات کے جبر، معاش کی مجبوری اور زندگی کی بے رنگی سے گھبرا کر سب ہی دوسری طرف چلے گئے تو مشرقی برلن کو کون آباد رکھے گا؟ وہ اس بات پر کامل یقین رکھتا ہے کہ اس آبادی کی ذمہ داری پارٹی کے کارکنوں اور سیاسی اہل کاروں پر عائد نہیں ہوتی بلکہ وہ کہتا ہے: ''ہم مشرقی برلن کو زندہ اور آباد رکھ سکتے ہیں کیوں کہ اصل برلن والے تو ہم ہیں، وہ نہیں۔'' (۱۹)

لیکن ایلسے کے لیے یہ دلیل کافی نہیں۔ وہ ۱۹۴۵ء میں جنگ کے بعد اپنی توانائیوں اور قوتوں کو قربان کر دینے کے باوجود کسی بھی صلے سے محروم ہے اور اب اس کا دم گھٹا جا رہا ہے، لہٰذا وہ سامان لے کر روانہ ہو جاتی ہے...... سفر کی جزئیات کے بعد منزلِ مقصود تک رسائی۔ یہ منزل اس کے لیے نئی دُنیا تھی۔ آزادی اور بے فکری کی دُنیا۔ جس میں انھی دو اجزا کا فرق تھا لیکن جب وہ صاف ستھرے خوش لباس نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے جمگھٹے کو دیکھتی ہے تو بجائے خوش ہونے کے اسے کوئی چیز یاد آنے لگتی ہے۔

رنگ اور روشنی سے بھری صاف ستھری اس نئی زندگی کے امکان میں اسے ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کمی اس چھوٹے سے مرد کی کمی تھی جس کے جسم میں چھاپے خانے کی رُوشنائی کی بُو بس چکی تھی۔ اس یاد کے ستاتے ہی اس کے لیے اس نئی زندگی اور دُنیا کی معنویت تبدیل ہو جاتی ہے۔

اس کے خیالوں میں مشرقی برلن کی بوسیدگی سے لبالب ٹرین چلنے لگتی ہے۔ تصورات کی ٹرین۔ لیکن اب اسے بوسیدگی اور بدبو سے کراہت اور نفرت محسوس نہ ہو رہی تھی بلکہ اسے خیال آ رہا تھا کہ وہ تھکے ہوئے، نڈھال اور خاموش لوگ ہی دراصل برلن کے باشندے تھے۔ نئے شہر میں وہ سوچ رہی تھی: ''میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ میں ابھی تک خواب دیکھ رہی ہوں۔ اپنا رستہ بھول آئی ہوں۔ میں یہاں اجنبی ہوں۔ یہ ڈبہ نما عمارتیں کیسی ہیں؟ میں کہاں ہوں؟ جیسے میں کسی اجنبی دُنیا، بلکہ چاند پر نکل آئی ہوں۔'' (۲۰)

بھیڑ اور مجمع میں وہ اپنے آپ کو اجنبیوں کے درمیان تنہا پاتی ہے۔ اس وقت اس کے پاس یہ اختیار تھا کہ وہ واپس چلی جائے اور اس نے یہی کیا۔ ۱۹۵۹ء میں اسے مشرقی برلن سے مغربی برلن سفر کی آزادی اسے ایک نوع کے خوف کے ساتھ سہی لیکن حاصل تھی اور اسی آزادی سے ''ایلسے'' نے فائدہ اُٹھایا۔

۱۹۶۳ء میں جب والٹر محنت کے تسلسل اور حالات کے جبر سے عاجز آ کر شہر چھوڑنے کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ آزادی ختم ہو چکی تھی۔ اسے اپنے تصورات پر بھی قدغن عائد کرنی پڑی۔ لیکن ''ایلسے'' اس کے ارادوں سے واقف ہو گئی۔ دوستوں کے علم میں آنے کا مطلب عوامی پولیس کو خبردار کرنا۔ لیکن تمام خطرات کے باوجود وہ فرار ہونے کے لیے تیار تھا۔ ان لمحوں میں فرار کا جذبہ اس پر اس قدر حاوی تھا کہ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ٹرام لائنیں مشرقی برلن کی ری پبلک سے، اسٹیٹ کی نظروں سے بچ کر کیموفلاج کر کے دیوارِ برلن کے نیچے سے رینگتی ہوئی چلی گئی ہیں اور عوامی پولیس ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی...... والٹر اس فرار کو موت سے زندگی کی جانب سفر سمجھ رہا تھا۔ اس نے اپنی حالت بالکل اس مچھلی کی سی محسوس کی جس پیٹ میں اس کا اپنا ڈالا ہوا کانٹا بالآخر پھنس گیا تھا۔

ایلسے نے چاہا کہ وہ پکار اُٹھے، لیکن صدائے احتجاج بلند کرنے والوں کا انجام یاد آ گیا۔ جب والٹر فرار ہوتے ہوئے دریا کے پُل پر سے گزرا تو اس نے مچھلی کے اندر جینے کا عزم دیکھ کر اسے پانی میں دوبارہ پھینک دیا جو سطحِ آب پر چند لمحے چمک کر کہیں غائب ہو گئی۔

کہانی بیانیہ اور علامت کا دلکش امتزاج ہے اور ممتاز شیریں نے اپنے ترجمے میں ان دونوں پہلوؤں کو بڑی خوبی سے پیشِ نظر رکھا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اور دیوارِ برلن کی تعمیر نے محض شہروں کو ہی تقسیم نہیں کیا تھا بلکہ گھرانوں اور خاندانوں میں بھی دراڑیں ڈال دی تھیں۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ ہوا کہ اس تقسیم نے ایک فرد کے اپنے تصورات اور آدرشوں کو تقسیم کر ڈالا۔ افسانے کا مرکزی خیال اس جملے میں سمٹ آتا ہے:

''عجیب بات ہے، میں تو یہ سمجھتی تھی کہ جدائی صرف اس وقت ہوا کرتی ہے جب ایک دوسرے کے ساتھ نباہ نہ ہو سکے۔''(۲۱)

شیزرے نے دراصل اس منقسم جذبات والی نسل کی بڑی خوبی کے ساتھ عکاسی کی ہے اور تقسیمِ وطن کے سیاسی اور جغرافیائی حوالوں کے بجائے انسانی اور جذباتی حوالوں کی مدد سے انسان کے انسان سے جُڑے رہنے کی بھرپور خواہش کی عکاسی کی ہے۔ ترجمہ نگار کی کامیابی یہ ہے کہ قاری اس ترجمے کی مدد سے سیاسی و جغرافیائی حوالوں سے شناسائی حاصل کرتے ہوئے اس عظیم تر انسانی المیے تک پہنچ جاتا ہے جو اس افسانے کا بنیادی خیال ہے۔

روسی افسانہ نگاروں میں سے لینن اور نوبل انعام یافتہ افسانہ نگار شولوخوف کے افسانے "Father" کا ترجمہ ممتاز شیریں نے ''باپ'' کے عنوان سے کیا ہے۔ شولوخوف بیسویں صدی کے اہم ترین افسانہ نگاروں میں گنا جاتا ہے۔ "Father" اس کی بہترین کہانیوں میں سے ایک ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک کثیر العیال دیہاتی ہے جس کی بیوی کئی بچّوں کی پیدائش کے بعد مر چکی ہے۔ محنت کی چکی میں پستے پستے اس کے نوجوان لڑکے انقلابِ روس کی حامی افواج میں شامل ہو جاتے ہیں۔

باغیوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے تمام مرد و زن کو لازمی بھرتی کے قانون کے تحت فوج میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار اپنے نوعمر بچّوں کی دہائی دیتا ہے۔ ان کی دیکھ بھال کی غرض سے رعایت طلب کرتا ہے لیکن اسے کوئی رعایت نہیں ملتی۔ رعایت اس لیے بھی نہیں دی جاتی کہ وہ باغی لڑکوں کا باپ ہے۔ ایک دن اس کا ایک لڑکا پکڑا جاتا ہے اور قید خانے میں لا کر

بند کر دیا جاتا ہے۔ دیگر باغیوں کے ساتھ اسے سنگینوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور اس منظر کے دیکھنے والوں میں اس کے باپ کو بھی شامل ہونا ہے ورنہ وہ لوگ اسے بھی مار ڈالتے۔ ایسے ہر موقع پر وہ اپنے چھوٹے بچوں کو دھیان میں لاتا اور اس اُمید پر جیتا رہا کہ جلد ہی جنگ ختم ہوگی اور وہ کم از کم اپنے بچوں کو دیکھ بھال خوش اسلوبی سے کر سکے گا۔ اس کی یہ اُمید پوری نہ ہونے پائی اور ایک دن دوسرا لڑکا بھی پکڑا گیا۔

باپ کے ساتھیوں نے اس کی وفاداری کو آزمانے کے لیے زخمی لڑکا اس کے حوالے کر دیا۔ بیٹے کو اُمید ہوئی کہ شاید سفر کے دوران باپ اسے بھاگ جانے کا موقع دے گا۔ باپ کو معلوم تھا کہ اسے لڑکا اسی لیے دیا گیا ہے۔ اگر وہ آزمائش پر پورا نہیں اُتر سکے گا تو نہ صرف یہ کہ اسے قتل کر دیا جائے گا بلکہ اس کا گھر بار بھی ضبط ہو جائے گا۔ ایک لڑکے کو بچانے کے لیے وہ بقیہ بچوں کی زندگی کیسے تباہ کر دیتا۔ بیٹے کی خوشامد اور رحم کی درخواست پر بظاہر وہ اسے بھاگ جانے کا اشارہ کرتا ہے لیکن خاموشی سے بندوق تان کر اس پر گولی چلا دیتا ہے۔ ساری زندگی باپ کے ذہن سے بیٹے کی بے بس نگاہوں کا تاثر محو نہیں ہوتا۔

غربت، مفلسی اور بے چارگی نے اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ اس نے مردہ بیٹے کے جسم سے بوسیدہ چمڑے کا کوٹ اور بوٹ اُتار لیے۔ اگرچہ اس کی لاش کو حسرت و غم سے دیکھتا ہے اور سینے سے لپٹا لیتا ہے۔ کہانی کا پہلا چونکا دینے والا جملہ یہ تھا جب وہ ملاح سے اپنی لڑکی کا تعارف کرانے کے بعد کہتا ہے: ''وہ مجھ سے کہتی ہے، ابا مجھ سے تمھارے ساتھ نہیں کھایا جاتا، جب میں تمھارے ان ہاتھوں کو دیکھتی ہوں۔'' (۲۲) وہ ملاح سے کہتا ہے: ''مگر چھوکری یہ نہیں سمجھتی کہ سب میں نے اسی کے لیے کیا ہے۔ اس کی اور دوسرے بچوں کی خاطر۔'' (۲۴)

سرکاری فوجیں سختی سے باغیوں کی سرکوبی میں مصروف ہیں۔ سوویت انقلاب کے ابتدائی مراحل کے پس منظر میں لکھی گئی یہ کہانی بے حد پُر اثر ہے۔ ممتاز شیریں نے اس کا ترجمہ کچھ اس خوبی سے کیا ہے کہ ترجمے کا گمان نہیں ہوتا۔ انھوں نے پس منظر میں کوئی تبدیلی نہیں کی لیکن زبان کے استعمال نے اسے اُردو کا افسانہ بنا دیا۔ ابوبکر عباد کے خیال میں: ''چوں کہ ایک تہذیب

اور ماحول دوسری تہذیب اور ماحول کے مترادف نہیں ہوسکتے اور ترجمے کا مقصد اجنبی ماحول سے واقفیت اور شناسائی بہم پہنچانا ہوتا ہے اسے مکمل تبدیل کرنا نہیں ہوتا۔" (۲۴) ان کا خیال یہ ہے کہ اگرچہ ممتاز شیریں نے مکالموں کو ہندوستانی رنگ دینے کی کوشش بڑی کامیابی سے کی ہے لیکن اسی بنا پر ان کی اس کوشش کو مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا۔

معلوم نہیں ابوبکر عباد نے یہ فیصلہ کیسے کیا کہ ممتاز شیریں نے ترجمے کی بنیادی ضرورتوں سے تجاوز کیا ہے۔ جب کہ افسانہ پڑھتے ہوئے ہر مقام پر جنگ آلود فضا چھائی ہوئی دِکھائی دیتی ہے۔ دریاؤں اور مقامات کے نام، بغاوت کا ذکر، کاسکیوں کے ظلم وستم کا بیان، کمیونسٹوں کے خلاف جذبات پورے افسانے کی فضا پر چھائے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے کہیں پر بھی افسانے کا اصل موضوع مجروح نہیں ہونے پاتا۔ رہا سوال لفظی ناہمواری کا تو اکا دکا لفظی ناہمواری سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

ناروے کے مشہور مصنّف نٹ ہیمسن (Knut Hamsun) کو دوستوفسکی اور تھامپسن کے پائے کا ادیب مانا جاتا ہے۔ اس کے ادبی کارناموں میں Hunger نامی مشہور ناول ہے۔ اس کے علاوہ Growth of the School کے لیے اسے ادب کا نوبل پرائز ملا۔ اخیر عمر میں ہٹلر کی حمایت کی اور اتحادیوں کی فتح کے بعد قید کردیا گیا۔ (۲۵) اس کی کہانی The Call of Life کا ترجمہ ممتاز شیریں نے "زندگی کا رس" (۲۶) کے نام سے کیا ہے۔ یہ ایک نوجوان عورت کی کہانی ہے جو مردہ شوہر کی لاش گھر میں چھوڑ کر اجنبی مرد کے ساتھ پوری رات گزار دیتی ہے۔ کہانی کے پلاٹ کی نسبت سے ایک پُراسرار فضا نمایاں رہتی ہے۔

مترجم نے بڑی خوبی سے اس نارویجن کہانی کو اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ کہانی کا پورا ماحول اور پس منظر ہمارے لیے اجنبی ہے۔ جس معاشرے کی عکاسی اس افسانے میں کی گئی ہے وہ بھی اجنبی ہے لیکن ترجمے کی روانی نے کہانی کی فضا سے نامانوس اجزا کو کم کردیا ہے۔

"نیا دور" کراچی کے شمارہ نمبر ۲۰، ۲۱ دسمبر ۱۹۵۰ء میں "حرفِ آغاز" لکھتے ہوئے ترجمے کے حوالے سے شیریں اپنے خیالات ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

''ایک واقعی اچھا ترجمہ وہ ہوتا ہے جس میں نہ صرف اصل کی رُوح برقرار رہے بلکہ اس میں مصنف کے اسلوب کا عکس تک اُتر آئے۔ اس لحاظ سے کسی ترجمے کے اچھے یا بُرے ہونے کی بات سمجھ میں آسکتی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ترجمہ، ترجمہ نہیں بلکہ اصل معلوم ہوتا ہے تو یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے اور یہی ایک اچھے ترجمے کی پہچان بھی ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی ترجمہ اصل سے بہتر کیسے ہوسکتا ہے؟ خوبصورت بنادینا ترجمے کی خوبی نہیں بلکہ خامی ہے۔''(۲۷)

ممتاز شیریں اپنے ترجموں میں اسی اصول پر عمل پیرا نظر آتی ہیں۔

بقول ابوبکر عباد: ''ممتاز شیریں اپنے افسانوں کا تانا بانا بُنتے ہوئے کشمکش اور تضاد کو خاص اہمیت دیتی ہیں اسی لیے ترجمے کے لیے وہ ایسے افسانے منتخب کرتی ہیں جس میں کشمکش ہو۔''(۲۸)

''فانوس'' کے سالنامے ۱۹۵۸ء میں ''میاں بیوی'' کے عنوان سے ''لوئی گیلو'' کا افسانہ شامل ہے جس کا ترجمہ ممتاز شیریں نے کیا تھا۔ یہ افسانہ بھی ممتاز شیریں کے ذوقِ انتخاب کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان کے اپنے افسانوں میں ازدواجی رفاقت ومحبت کی جھلکیاں اکثر نمایاں رہتی ہیں۔ یہ جھلکیاں ''آئینہ'' کی ''نانی'' کی ازدواجی زندگی میں بھی نظر آجاتی ہے۔ ''رانی'' اور ''شکست'' کے مرکزی کرداروں میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں اور ''اپنی نگریا'' کے صحافی میاں بیوی کے علاوہ ''آندھی میں چراغ'' کے غربت زدہ جوڑے کی تصویر کشی میں بھی نمایاں ہیں۔ رفاقت کی یہی جھلک وہ اپنے افسانے ''گھنیری بدلیوں'' کی مرکزی کردار ''نجمہ'' کے ذریعے اُبھارنے میں کامیاب رہتی ہیں۔ ازدواجی زندگی کے یہ تمام پہلو ان کے نزدیک ''اصلِ حیات'' ہیں۔ مذکورہ افسانے ''میاں بیوی'' کا بنیادی موضوع بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ ممتاز شیریں نے بڑی خوبی سے اِسے اُردو کا لباس عطا کیا ہے۔

ہندوستانی زبانوں میں سے ممتاز شیریں نے بنگالی، مراٹھی اور کنڑی کہانیوں کے ترجمے کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ کہانیوں کا ترجمہ انگریزی کے ذریعے کیا گیا ہے جب کہ بعض کنڑی کہانیوں کا براہِ راست ترجمہ بھی کیا ہے۔

ممتاز شیریں نے زیادہ تر افسانوں کے ترجمے اس وقت کیے جب وہ ''نیا دور'' نکالا کرتی تھیں اور مقامی و بین الاقوامی منتخب افسانوں کے تراجم لازمی طور پر ''نیا دور'' کی ہر اشاعت میں شامل ہوتے تھے۔ اچھا ترجمہ بروقت دستیاب نہ ہوتا تو اکثر یہ ترجمے وہ خود کیا کرتی تھیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے کئی ترجمے ''ماستی وینکٹیش آئینگار'' کے افسانوں کے کیے۔ یہ کنڑی زبان کے پائے کے ادیب تھے اور بنگلور ہی میں قیام پذیر تھے۔

بقول ممتاز شیریں: وہ ہر لحاظ سے کنڑی ادب کے ٹیگور کہلانے کے مستحق ہیں۔ ماستی کو افسانے، شاعری اور تنقید پر مساوی دسترس حاصل ہے۔ وہ انھیں کرناٹک کلچر پر ایک قوت قرار دیتی ہیں جنھوں نے نہ صرف کرناٹک کلچر پر ایک کتاب لکھی بلکہ اپنی تحریروں میں اس کلچر کو نمایاں کیا۔ (۲۹) شیریں کے خیال میں ماستی کے فن کا خاص جوہر سادگی ہے۔

''نیا دور'' کے شمارہ نمبر ایک میں ممتاز شیریں نے ماستی کے ایک افسانے کا ترجمہ ''دہی والی'' کے عنوان سے کیا۔ بیانیہ اسلوب میں کہی گئی یہ کہانی ایک جانب مصنف کے خاص اندازِ سادگی کی نمائندہ ہے دوسری جانب ممتاز شیریں کے پسندیدہ نسوانی کردار یعنی ایک ادھیڑ عمر، مصیبت زدہ، پریشان حال عورت کو نمایاں کرتی ہے۔

پاک و ہند کے اکثر علاقوں میں ہاتھ کی محنت سے روزی کمانے والی اکثر بوڑھی عورتوں کی طرح یہ بھی بیٹے اور بہو کی بے التفاتی کا شکار، پوتے پوتیوں کو کھلانے اور ناز برداری کرنے کی خواہش مند ہے۔ کہانی کی راوی اس پر ترس کھاتی ہے اور یہ اپنے دُکھڑے اسے سُنا جاتی ہے۔ بیٹے، بہو کی بے التفاتی کی وجہ سے پرانا زخم بھی تازہ ہو جاتا ہے یعنی مرحوم شوہر کی بے وفائی کا جسے بھڑکیلی ساڑی پہننے والی دوسری عورت بھا گئی تھی اور وہ اس کے پاس چلا گیا تھا۔ لیکن دہی والی ''منگماں'' اپنی آبرو محفوظ کیے جیتی رہی۔ بیٹے نے بیوی کی شکل دیکھ کر بے رُخی برتی۔ بیٹے کا کہنا یہ

تھا کہ میں دونوں میں سے کسے چھوڑوں، بہو کا موقف یہ سامنے آیا کہ وہ کم از کم اپنے بچے پر اپنا اختیار چاہتی ہے۔ دراصل یہ پورا قصہ اختیار کے حصول کا تھا۔ بہو اپنی ساس کے بیٹے کو اپنے اختیار میں لینا چاہتی تھی اور ساس نے اس کا توڑ یہ نکالا کہ پوتے کو محبت کی چاشنی میں ڈبو کر اپنا لیا۔

ہندوستان کی فضاؤں میں یہ قضیہ بہت پرانا ہے اور کسی نہ کسی شکل میں اب تک چل رہا ہے۔ کہانی کار نے قصباتی اور دیہی زندگی کے تال میل سے اس میں جو رنگ آمیزیاں کی ہیں شیریں نے ان سب کا خیال رکھا ہے..... یہی اس ترجمے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ بوڑھی ''دہی والی'' کا کردار ''آئینہ'' کی ''نانی بی'' اور ''انگڑائی'' کی بوڑھی ملازمہ سے بڑی حد تک مماثل دِکھائی دیتا ہے جو زمانے بھر کے دُکھوں سے لدی چادر کا پلو سر پر ڈالے محنت اور ہمدردی کا پیکر بن چکی ہیں۔

''نیا دور'' نمبر ۴ میں ماستی ہی کے ایک اور افسانے کا ترجمہ ''یہاں کا انصاف'' کے نام سے ممتاز شیریں نے کیا ہے۔ پچھلے افسانے میں ہم نے دیکھا کہ ممتاز شیریں کے پسندیدہ کردار کی جھلک ہے اور اس افسانے میں ان کے پسندیدہ ترین موضوع کی جھلک نمایاں ہے۔ یعنی عصری حقائق، ذہنی و نفسیاتی پیچیدگی اور اقدار کی کشمکش۔ اسلوب کے اعتبار سے یہ بھی ایک بیانیہ ہے۔ بعض مقامات پر مکالموں کے ذریعے کرداروں کی کشمکش اور فطری رکھ رکھاؤ کو بیان کیا گیا ہے...... پادری مسٹر ہنری کے کردار میں یک طرفہ سادگی نمایاں ہے اور یہی یک طرفہ انداز دونوں ''وڈوڑ'' بھائیوں کے وجود میں اخلاقی اور نفسیاتی کشمکش کا سبب بن جاتا ہے۔ لیکن پوری کہانی میں اگر کوئی کشمکش سب سے زیادہ واضح اور نمایاں ہے تو وہ جج کے اپنے اندر پیدا ہونے والی کشمکش ہے۔

انسانی لحاظ سے وہ اس پیچیدہ عمل کی نزاکت سے واقف ہے۔ اپنے مذہب اور دیوتا کی بُرائیاں سُنتے سُنتے ''وڈوڑ بھائی''، ''مسٹر ہنری کے خدا'' کے قائل ہونے کے بجائے ذاتِ واحد کی موجودگی کے ہی منکر ہو گئے۔ دوسری جانب اقرار جرم کی بنیاد پر انھیں سزا دینا بھی لازم تھا۔ لیکن جج، مسٹر ہنری کو ترغیب گناہ کی سزا نہیں دے سکتا تھا۔ اگر چہ جج کو یقین ہے کہ جس طرح مسٹر ہنری کی مذہبی جذباتیت نے ان دونوں نوجوانوں کو نقصان پہنچایا ہے اسی طرح خدا نے عدم

توازن کے مظاہرے پر مسٹر ہنری کو نقصانات بھی پہنچائے ہیں۔ اگر وہ صاحبِ ایمان ہوں تو اس امر کو پہچان لیں گے۔ یہ ایمان جج کا ہے۔ لیکن جج کا یہ ایمان بھی بہت واضح اور نمایاں ہے کہ دُنیا میں فراہم کیے جانے والے انصاف میں کچھ نہ کچھ کسر رہ جاتی ہے اصل انصاف تو کہیں اور ہی ہوتا ہے۔

مصنّف کی جزئیات نگاری کو مترجم نے بڑی خوبی اور چابک دستی سے نبھایا ہے اور بیانیہ میں کوئی سقم نمودار نہیں ہوتا۔ اصل زبان جاننے کی وجہ سے یہاں روانی اور تسلسل میں ایک خاص قسم کا بہاؤ پیدا ہو جاتا ہے جس سے ترجمے کا حُسن دو چند ہو جاتا ہے۔

''اگرپا کی اگادی''، ''ساقی'' کراچی کے افسانہ نمبر جولائی، اگست ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ بھی ''ماستی وینکیٹش آئینگار'' کا تحریر کردہ ہے جسے ممتاز شیریں نے اپنے مخصوص بے تکلّف انداز میں ترجمہ کیا ہے۔ ''اگرپا'' گاؤں کے مکھیا کا نام ہے اور ''اگادی'' نئے سال کے طلوع کا تہوار ہے۔ افسانے میں خالص سادہ بیانیہ سے کام لیتے ہوئے صرف یہ بتایا گیا ہے کہ گاؤں کے مکھیا اگرپا نے یہ تہوار کیسے منایا؟

دیہی زندگی میں صبح کے آغاز سے دن کے اختتام تک اسے کن کن ہیجانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ معمول کے واقعات اور عمومی مشکلات سے گزرنے میں اسے کیا مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ دیہات کی زندگی پانی کے جھگڑوں، محصولات کی ادائیگی، خانگی قضیے پیش کرنے کے علاوہ اور کیا مسئلہ رکھ سکتی ہے؟ البتہ کبھی کبھار جنگل سے چیتے آ کر جانوروں کے ریوڑ پر ہلّہ بول دیتے ہیں۔ پورے دن کی رُوداد میں شاید یہ سب سے بڑا ہیجانی واقعہ تھا جو رُونما ہوا۔ یہیں سے ''اگرپا'' کے معمولات میں عدم توازن پیدا ہوا جس کی وجہ سے کہانی میں خانگی چھیڑ چھاڑ کا وہ لطف پیدا ہوا جو اس تھکا دینے والے معمول میں ہوا کا نرم جھونکا سا تھا۔ ساس بہو کی نوک جھونک اس کا ایک دلچسپ پہلو ہے۔ دیہات کے اس منظرنامے میں ہر مسئلہ ایک یقینی حل کی جانب بڑھتا چلا جاتا ہے اور سکون و اطمینان کی وہ فضا مرتب ہوتی ہے جس فضا کی ممتاز شیریں بطور افسانہ نگار خواہاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہیں یہ یقین مستحکم ہوتا ہے کہ ترجمے کے لیے افسانوں کا انتخاب کرتے

ہوئے موضوع اور پیش کش کی سطح پر ممتاز شیریں اپنے طبعی میلان کا خیال ضرور رکھتی ہیں۔اس ترجمے کی زبان خالص وہی زندگی کی نمائندگی کرتی ہے۔جس طرح افسانہ نگار نے افسانہ لکھتے ہوئے زبان کی سادگی کا خیال رکھا اسی طرح ممتاز شیریں نے ترجمے میں بھی اس کا لحاظ رکھا۔

ماستی کی ایک اور کہانی کا ترجمہ ممتاز شیریں نے ''ایک پرانی کہانی'' کے نام سے کیا جو ''نقوش''لاہور کے ستمبر،اکتوبر۱۹۵۲ء کی اشاعت میں شامل ہے۔

منتخب افسانوں کے تراجم کے سرسری مطالعے سے ہی اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ افسانوں اور تنقید کی طرح ان کے تراجم بھی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔انگریزی اور مغربی ادب سے ناواقفیت ان کے دور میں زیادہ اور اب بھی اکثر ہے،اس اعتبار سے تراجم کے ذریعے مغربی ادب کے بہترین انتخاب تک رسائی باذوق قارئین کے لیے ایک بڑی ادبی خدمت تھی جو ممتاز شیریں نے انجام دی۔

مندرجہ بالا تجزیے کی روشنی میں ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں ممتاز شیریں اُردو ادب کی دُنیا میں چند غیر معمولی امتیازات کی حامل ہیں۔اوّلاً وہ اُردو افسانے کی اوّلین خاتون نقاد قرار دی جاتی ہیں،دوسرے یہ کہ وہ خود بھی اپنے اسلوب میں ایک منفرد افسانہ نویس ہیں۔بطور افسانہ نویس ان کے امتیاز میں وہ تراجم غیر معمولی اضافہ کردیتے ہیں جو انھوں نے مختلف زبانوں کے بہترین افسانوی ادب سے کیے۔

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ انگریزی زبان کی ایک اچھی قاری اور مصنفہ ہونے کی بنا پر انگریزی سے ان کے تراجم قابلِ قدرت اہمیت کے حامل قرار پاتے ہیں۔فنِ ترجمہ نگاری میں ان کی اہمیت کا ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ مغربی زبانوں کے ساتھ ساتھ بعض مشرقی زبانوں کے اعلیٰ درجے کے افسانوں کو بھی اُردو میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ان سب سے بڑھ کر ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُردو فکشن کی اوّلین نمایاں خواتین میں وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے مختلف زبانوں سے تراجم کا ایک معیار اُردو زبان کو دیا۔

حواشی:

(۱) ممتاز شیریں، ''پاکستانی ادب کے چار سال''مشمولہ ''معیار''۱۹۶۱ء، لاہور، ص ۱۹۰

(۲) ابوبکر عباد، ''ممتاز شیریں ناقد، کہانی کار''، ۲۰۰۶ء، دہلی، ص ۲۶۸

(۳) ممتاز شیریں بنام اختر انصاری، مشمولہ ''نقوش''، ۱۹۶۸ء، ص ۵۱۳

(۴) ممتاز شیریں، ''تبصرہ: رقصِ ناتمام''، مشمولہ ''نیادور'' کراچی، نمبر ۱۴/۱۵، ص ۲۹۲، ۲۹۳

(۵) نغمہ فراز، ''ممتاز شیریں شخصیت اور فن''، ۱۹۸۰ء، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے اُردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، زیرِ نگرانی ڈاکٹر انوار احمد، ص ۱۸۵

(۶) ممتاز شیریں بنام محمد سلیم الرحمٰن، مشمولہ ''قومی زبان'' کراچی، ۱۹۹۰ء، اکتوبر، ص ۱۹

(۷) ممتاز شیریں، ''مقدمہ درِ شہوار''، ۱۹۵۸ء، مکتبۂ شعور، کراچی، ص ۲۶۷

(۸) سیگرڈ کا ہلے، ''پیش لفظ، ہم عصر جرمن افسانے''، مترجم احمد اظہر الدین اظہر، ۱۹۶۷ء، فیروز سنز، پاکستان، ص ۶

(۹) ماری لوئز کاشنٹز، The Oxford Companian to German Literature مرتبہ گارلینڈ، ہنری اور ماری، ۱۹۷۶ء، آکسفرڈ، ص ۴۵۸

(۱۰) ماری لوئز، کاشنٹز، ''موٹی بچی''، مشمولہ ''ہم عصر شاہکار جرمن افسانے''، ص ۵۷

(۱۱) ایضاً، ص ۶۷

(۱۲) ایضاً

(۱۳) گرڈ گیسر، The Oxford Companian German Literature، ص ۲۶۲

(۱۴) گرڈ گیسر، ''سبز جیکٹ''، مشمولہ ''ہم عصر شاہکار جرمن افسانے''، ص ۱۸۱

(۱۵) ایضاً، ص ۱۷۸

(۱۶) ایضاً

(۱۷) وولف ڈیٹرش شنرے، The Oxford Companian to German Literature، ص ۴۵۸

(۱۸) وولف ڈیٹرش شنر ے، ''پھوٹ''، ص ۲۵۶

(۱۹) ایضاً، ص ۲۶۰

(۲۰) ایضاً

(۲۱) ایضاً، ص ۲۸۶

(۲۲) مائیکل شولوخوف، ''باپ''، مشمولہ ''نیا دور''، شمارہ نمبر ۲۱/۲۲، ص ۶۲

(۲۳) ایضاً

(۲۴) ابوبکر عباد، ص ۲۷۷

(۲۵) ایضاً، ص ۲۷۸

(۲۶) ممتاز شیریں، مشمولہ ''نقوش'' لاہور، ۱۹۵۲ء، نومبر/دسمبر

(۲۷) ''حرفِ آغاز''، مشمولہ ''نیا دور''، شمارہ ۲۰/۲۱، ص ج

(۲۸) ابوبکر عباد، ص ۲۸۲

(۲۹) ممتاز شیریں، ''تعارفی نوٹ: اگر پا کی اگادی''، مشمولہ ''ساقی'' کراچی، ۱۹۵۲ء، جولائی/اگست، افسانہ نمبر، ص ۳۳

روسی کہانی

باپ

(مائیکل شولوخوف)

سورج کی نیم مدھم شعاعیں ایک کاسک گاؤں کے آس پاس پھیلی ہوئی سبز اور مٹیالی جھاڑیوں میں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ قریب ہی ایک ناؤ تھی جس میں بیٹھ کر میں دریائے ڈان کو عبور کرنا چاہتا تھا۔ میں یونہی راستہ کاٹ رہا تھا۔ گیلی ریت میں سے جس سے گلی سڑی شاخوں اور پتوں کی سی گندی بو اُٹھ رہی تھی۔ پگڈنڈی کسی سہمے ہوئے خرگوش کی لیک کی طرح جھاڑیوں میں سے بل کھاتی ہوئی چلی گئی تھی۔ پھولا ہوا، قرمزی آفتاب گاؤں کے اس پار قبرستان میں گر پڑا۔ اب شام کا جھٹ پٹا سوکھی جھاڑیوں میں سے میرا پیچھا کر رہا تھا۔

کشتی دریا کے کنارے لنگر انداز تھی۔ اس کے نیچے جھلملاتا ہوا نیلا پانی قلقل کر رہا تھا۔ چپوبے تکے پن سے اِدھر اُدھر چل رہے تھے اور لوہے کے کڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر کررا رہے تھے۔ کشتی کی کائی جمی ہوئی تہ سے کشتی بان پانی نکال نکال کر باہر پھینک رہا تھا۔ اُس نے سر اُٹھایا۔ اپنی پیلی پیلی بھینگی آنکھوں سے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور اُداسی سے پوچھا۔

''پار جانا چاہتے ہو؟ ایک منٹ میں لے چلوں گا۔ ذرا رسہ تو کھول دو۔''

''کیا ہم کشتی کو سنبھال سکیں گے؟ صرف ہم دو؟''

''ہمیں کوشش کرنی ہوگی۔ جلد ہی اندھیرا چھا جائے گا اور شاید کوئی اور ادھر آ نکلے۔''

کشتی بان نے ڈھیلے پائنچوں والی پتلون کو اُلٹتے ہوئے مجھ پر دوبارہ نگاہ ڈالی اور کہا۔

''تم اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ کہاں سے آ رہے ہو؟''

''قنوج سے''

اس نے ٹوپی اُتار کر ناؤ میں رکھ دی۔ اپنے بالوں کو جو کاکاس کی کالی دھاری اور چاندی

کی مانند ایک جھٹکے ساتھ پیچھے کیا اور اپنے بوسیدہ دانت دِکھاتے ہوئے میری طرف آنکھ جھپکائی۔

''چھٹی پر جارہے ہو۔آں؟۔چھپ کر۔میں جانتا ہوں۔اینہہ!''

''نہیں۔میں سبکدوش ہوگیا ہوں، ہماری جماعت کو فوجی خدمت سے بری کر دیا گیا ہے۔''

''اور یہ کہو! تب تو تمہارا ضمیر صاف ہے۔''

ہم کشتی چلانے بیٹھ گئے۔ڈان جیسے ہم سے مذاق کر رہا ہو۔ندی کا دھارا ہمیں دریا کی پودوں سے جو کنارے پر اُگ آئے تھے لے چلا۔کشتی کے پھٹے ہوئے پیندے میں پانی رس رس کر سائیں سائیں کی آواز پیدا کر رہا تھا۔ملاّح کی ننگی پنڈلیاں جن پر نیلی رگیں کھنچی ہوئی تھیں، اس کے مضبوط پٹھوں کو ظاہر کر رہی تھیں۔اس کے بازو لمبے اور سوکھے تھے۔اس کی اُنگلیوں کی پوریں سخت گانٹھیں دار تھیں۔ڈبلا پتلا سا آدمی، جھکے ہوئے کندھے اور خمیدہ پشت۔بظاہر وہ کشتی بڑے بھونڈے پن سے کھے رہا تھا لیکن اس کے چپوؤں کے سرے بڑی تیزی اور صفائی سے لہروں کو کاٹتے ہوئے پانی کی گہرائیوں میں ڈوب جاتے تھے۔اس کی تیزی سے چلتی ہوئی سانس کی آواز میں سُن سکتا تھا۔اس کی اونی بنیان سے پسینے اور تمباکو کی تیز اور پانی کی بھیگی بو آرہی تھی۔یکا یک وہ چپو پر جھکا اور میری طرف منہ پھیر کر بولا۔''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اب آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ہم جھاڑیوں میں پھنس گئے ہیں۔براسودا ہے!'' ایک تیز موج نے کشتی کو ایک زور کا تھپیڑا لگایا اور اس کے دنبالے کو خطرناک طور پر گھما کر ہمیں درختوں کے تنوں کی طرف بہالے گئی۔

آدھ گھنٹے بعد ہم سوکھی ٹہنیوں میں بُری طرح جکڑ گئے۔چپو ٹوٹ چکے تھے۔ان کے ٹکڑے بیکسی کے عالم میں لوہے کے کڑوں سے لٹک رہے تھے۔کشتی کے پیندے میں ایک سوراخ تھا جس سے پانی اُبل اُبل کر غر غر کرتا اندر آرہا تھا۔ہم نے درختوں پر ہی رات بسر کرنے کی ٹھان لی۔ملاّح میرے قریب دبکا بیٹھا تھا۔اس کے پاؤں ایک ڈالی کے گرد حلقہ بنائے ہوئے تھے۔وہ پائپ سے دُھواں کھینچ رہا تھا، باتیں کرتا جارہا تھا اور جنگلی قازوں کے پروں کی سرسراہٹ کو کان لگائے سُن رہا تھا جو اس گہری تاریکی کو چیرتی ہوئی ہمارے سروں پر سے گزر رہی تھیں۔

''اچھا تو تم گھر جا رہے ہو، ا ہنہہ! اور وہاں یقیناً تمھاری ماں تمھاری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ اس کا بیٹا، بڑھاپے کا سہارا، گھر آ رہا ہے۔ اب گھر اس کو سکون بخشے گا۔ اس کے بوڑھے دل میں بھی حرارت پیدا ہوگی مگر ہاں تمھیں اس کی کیا پروا۔ ماں اس طرح تمھاری راہ دیکھے کہ دوسروں کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور تمھاری یاد میں رات رات بھر آنسو بہائے! پر تمھیں کیا، تم سب کے سب ایسے ہی ہوتے ہو۔ جب تک تم خود بچوں والے نہیں ہو جاتے ماں باپ کے دُکھوں پر تمھیں ذرّہ بھر ترس نہیں آتا۔''

''اگر کبھی بھولے سے کوئی عورت مچھلی صاف کرنے میں پتہ توڑ دے اور تم اس مچھلی کا چمچہ بھر شوربا منہ میں ڈالو تو وہ نگلنے میں کتنا کڑوا ہوتا ہے۔ یہی میرا حال ہے۔ میں جیتا ہوں مگر زندگی کا جو نوالہ بھی لیتا ہوں کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ میں اسے نگل لیتا ہوں، برداشت کر لیتا ہوں، مگر کبھی کبھی سوچتا ہوں۔ ''زندگی زندگی! ابھی تیرا کھیل ختم ہونے میں کتنی دیر ہے؟''

''تم ہمارے اس ملک کے نہیں ہو۔ تم اجنبی ہو۔ سچ کہو۔ کیا میرے لیے یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں اپنے گلے میں رسّی کا پھندا ڈال لوں؟''

''میری ایک لڑکی ہے۔ نتاشا اس کا نام ہے۔ یہی کوئی سترہ سال کی۔ ہاں صرف سترہ سال کی۔ وہ مجھ سے کہتی ہے ابا مجھ سے تمھارے ساتھ نہیں کھایا جاتا۔ جب میں تمھارے ان ہاتھوں کو دیکھتی ہوں۔ وہ کہتی ہے اور مجھے یاد آتا ہے کہ تم نے انہی ہاتھوں سے میرے بھائیوں کا خون کیا تو میرا حلق پھول جاتا ہے۔''

''مگر چھوکری یہ نہیں سمجھتی کہ یہ سب میں نے اسی کے لیے کیا۔ اس کی اور دوسرے بچوں کی خاطر۔''

''میری شادی کم سنی میں ہوگئی تھی۔ خدا نے مجھے بیوی ایسی دی جو خرگوشوں کی طرح بچے جنتی تھی۔ اُس نے یکے بعد دیگرے آٹھ جانوں کا بوجھ مجھ پر ڈالا۔ ان کے پیٹ تو مجھی کو بھرنے تھے۔ نویں بچے نے اس کی جان لے لی۔ زچگی تو ٹھیک ہوئی مگر وہ پانچ روز بعد بخار میں مر گئی اور میں اکیلا رہ گیا۔ خدا نے ان بچوں میں سے کسی کو واپس نہیں لیا مگر میں نے اس کے لیے کتنی ہی

دُعائیں کیں۔ ایون سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اس کی شکل مجھ سے بہت ملتی تھی۔ کالے بال اور نِک سُک سے درست اور ایک شکیل کاسکی نوجوان تھا۔ دوسرا لڑکا ایون سے چار سال چھوٹا تھا۔ وہ اپنی ماں پر پڑا تھا۔ قد چھوٹا مگر توند بڑی۔ اس کے بال سفیدی مائل بھورے تھے اور آنکھیں نیلی نیلی۔ اس کا نام ڈیانیلو تھا اور وہ میرا چہیتا بیٹا تھا۔

میں نے ایون کی شادی گاؤں ہی میں کردی۔ اس کا بچہ بڑا پیارا تھا۔ اس کے بعد ڈیانیلو کے لیے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ بدامنی شروع ہوگئی۔ ہمارے گاؤں کے لوگوں نے سوویٹ والوں کے خلاف بغاوت کردی۔ ایون میرے پاس دوڑا آیا۔ ''ابا، ابا! میرے ساتھ سرخ فوج میں شامل ہو جاؤ، میں تم سے التجا کرتا ہوں ابا مسیح کی قسم ہمیں سرخ فوج کا ساتھ دینا چاہیے، کیونکہ وہ حق پر ہے اور انصاف کے لیے لڑ رہی ہے۔''

ڈیانیلو نے بھی وہی وعظ شروع کیا۔ دونوں بہت دیر تک مجھ سے التجا اور اصرار کرتے رہے مگر میں نے کہا ''میں تمھیں نہیں روکتا۔ تم جہاں چاہو جاسکتے ہو لیکن میں یہیں رہوں گا۔ مجھے یہاں ابھی سات پیٹ بھرنے ہیں۔''

وہ چلے گئے۔ گاؤں میں لوگ مسلح ہو رہے تھے۔ جسے جو کچھ ملا اُس نے وہیں اُٹھالیا۔ آخر انھوں نے محاذ کو! محاذ کو! چلاتے ہوئے مجھے بھی پکڑلیا۔ میں نے بھری چوک میں ان سے گڑگڑا کر التجا کی۔ ''ہم وطنو، تم سب جانتے ہو کہ میں سات بچّوں کا باپ ہوں۔ گھر میں میرے سات بچّے بچھونوں پر پڑے ہیں۔ اگر میں مر جاؤں تو ان کی کون خبر لے گا؟ انھیں کون دیکھے گا؟ ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ میں زبردستی پکڑلیا گیا اور محاذ پر بھیج دیا گیا۔''

مورچہ ہمارے گاؤں سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ ایک دن ایسٹر سے پہلے کچھ قیدی لائے گئے۔ ڈیانیلو شکا میرا چہیتا بیٹا بھی ان میں تھا۔ انھیں کپتان کے سامنے پیش ہونے سے پہلے بازار میں گھمایا گیا۔ کاسکی اپنے گھروں سے دوڑے آئے۔ خدایا مدد! ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔

''دے پٹکو انھیں بزدل! کمینے! جب وہ جرح سے واپس لائیں جائیں گے تو ہم انھیں سلادیں گے واہیات رسموں کے بغیر۔''

میں وہیں کھڑا تھا۔ میرے پاؤں لرز رہے تھے مگر میں نے ان پر یہ ظاہر ہونے نہ دیا کہ اپنے ڈیانیلو کے لیے میرا دل کتنا دھڑک رہا ہے۔ میں نے کاسکیوں کو اپنی طرف اشارہ کرتے اور آپس میں سرگوشیاں کرتے دیکھا۔ سرجنٹ میجر آر کا شا میری طرف بڑھا۔

''کیوں مکی شاردا، ان کمیونسٹوں کو ختم کرنے میں ہمارا ساتھ دو گے نا؟''

''کیوں نہیں۔ ضرور۔ خونی بدمعاش! درندے!!'' میں نے کہا۔

''اچھا، تو لو، یہ سنگین ہے یہاں کھڑے ہو جاؤ! دروازے کے قریب'' یہ کہتے ہوئے اس نے عجیب معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ''ہم تم پر کڑی نظر رکھیں گے۔ مکی شاردا، ہوشیار رہنا میرے دوست! ورنہ تمھیں سختی کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

میں دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور یہ بھیانک خیال میرے دماغ میں گھومنے لگا۔

''مقدس مریم، خداوند یسوع کی ماں! کیا مجھے خود اپنے بچے کو قتل کرنا ہوگا؟''

گارڈ روم سے شور اُٹھا قیدی باہر لائے گئے۔ ڈیانیلو پہلا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میرا خون جمنے لگا۔ اس کا سر پیپے کی طرح سوجا ہوا تھا اور جگہ جگہ کھال چھل گئی تھی۔ گاڑھے خون کے قطرے اس کے چہرے پر سے بہہ رہے تھے۔ موٹے اونی دستانے اس کے بالوں میں ٹھنسے ہوئے تھے۔ زدوکوب کے بعد انھوں نے دستانوں سے ڈیانیلو کے زخموں کا خون بند کرنا چاہا تھا۔ خون سے تر دستانے بالوں میں چپک گئے تھے۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوا تھا جب قیدی گاؤں لائے جا رہے تھے۔

میرے ڈیانیلو نے ڈگمگاتے پاؤں سے راستہ طے کیا۔ جونہی مجھ پر نظر پڑی اُس نے اپنے دونوں ہاتھ میری طرف پھیلا دیے اور مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کی ایک آنکھ خون میں ڈوب گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ڈیانیلو کو قتل نہیں کیا تو گاؤں والے مجھے وہیں ڈھیر کر دیں گے اور میرے ننھے بچے لاوارث یتیموں کی طرح اس وسیع دُنیا میں پھینک دیے جائیں گے۔

جب ڈیانیلو اس جگہ پہنچا جہاں میں کھڑا تھا۔ تو اس نے کہا ''ابا، پیارے ابا، خدا حافظ!''

آنسو اس کے رُخساروں پر بہہ کر خون کو دھو رہے تھے۔ اور میں...... میں ہاتھ نہ اُٹھا سکا۔ اتنا وزنی ہو گیا تھا۔ بالکل ایک لکڑی کی طرح سنگین میرے بازو میں چبھتی معلوم ہو رہی تھی۔ پھر میں نے رائفل کے کندے سے اپنے نونہال کے ایک کاری ضرب لگائی۔ یہاں کان کے پیچھے...... اس نے ایک چیخ ماری ''اوہ۔ اوہ'' اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور گر پڑا۔

میرے کاسکی دوستوں کے منہ سے ہنسی پھوٹ رہی تھی۔ ''خوب مارا، مکی شاردا! لگاؤ ہا ہا ہا۔ ہا ہا اپنے ڈیانیلو سے بہت خفا معلوم ہوتے ہو۔ پھر مارو، ورنہ ہمیں ذرا سا تمھارا خون بھی بہانا پڑے گا۔'' کپتان ڈیوڑھی پر آیا اور دِکھاوے کے لیے چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو کچھ حکم دینے لگا مگر اس کی آنکھوں میں نفرت انگیز ہنسی تھی۔

کاسکی قیدیوں پر ٹوٹ پڑے اور انھیں سنگینوں سے قتل کرنا شروع کیا۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور میں بے تحاشہ بھاگ کھڑا ہوا لیکن میں نے اپنے ڈیانیلو کو خاک اور خون میں لوٹتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ سرجنٹ میجر نے سنگین اس کے گلے میں گھونپ دی تھی۔ سوائے ایک خر۔ ر۔ ر کے ڈیانیلو کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔

کشتی کے تختے پانی کے دباؤ سے کرکرا رہے تھے۔ اور سپیدے کا تنا ہمارے نیچے جھک گیا تھا۔ مکی شاردا نے اپنے پاؤں سے کشتی کے پیندے کو ٹٹولا جو پانی کی سطح پر اُبھر آیا تھا اور پائپ جلتی ہوئی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''ناؤ ڈوب رہی ہے۔ ہمیں کل دوپہر تک اس درخت پر بیٹھنا ہوگا۔ لعنت ہمارے نصیب پر۔''

وہ بہت دیر تک خاموش رہا پھر اُس نے آہستہ سے دبی آواز میں بولنا شروع کیا۔ ''انھوں نے اس دن کے لیے مجھے پولیس سکشن کا چارج دیا۔''

ڈان اس وقت سے اب تک بہت پانی بہہ چکا ہے مگر ابھی تک میں راتوں کو ایک آخری ہچکی کی آواز اور موت کی خرخراہٹ سُنتا ہوں جیسے کسی کا دم گھٹ رہا ہو۔ وہی آواز جو میں نے اس دن بھاگتے ہوئے سُنی تھی، اپنے ڈیانیلو کی موت کی خرخراہٹ!

اور یوں میرا ضمیر اپنا انتقام لیتا ہے۔

موسمِ بہار تک سُرخ پوشوں کو آگے بڑھنے سے روکا۔ اس کے بعد جنرل سیکریٹو ہماری مدد کو آگئے اور ہم نے دُور تک دریائے ڈان سے ہوتے ہوئے صوبہ سارا ٹو تک ان کا تعاقب کیا۔ چونکہ میرے بیٹے سرخ پوشوں میں جا ملے تھے اس لیے سروس میں میرے لیے کوئی رعایت نہ تھی، گو میں کئی بچوں کا باپ تھا۔

ہم شہر بالا شار تک بڑھ آئے۔ مجھے اپنے بیٹے ایون کی کچھ خبر نہ ملی تھی۔ اچانک کاسکیوں میں ایک افواہ اُڑی۔ شیطان جانے انھوں نے اس خبر کو کیسے پالیا تھا کہ ایون نے سرخ پوشوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور نمبر ۳۶ کاسکی رجمنٹ میں شامل ہو گیا ہے۔ گاؤں کے لوگ مجھے دھمکی دینے لگے۔ ''ہم تمھارے اس ایواشکا کو پکڑیں گے اور گھاس کھلائیں گے۔'' ہم ایک دیہات میں آئے۔ یہاں ۳۶ رجمنٹ نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ جلد ہی انھوں نے میرے ایون کو ڈھونڈ نکالا۔ اس کی مشکیں کس دیں اور گھسیٹتے ہوئے گارڈ روم میں لے آئے۔ وہاں انھوں نے اسے بُری طرح پیٹا اور مجھے حکم دیا۔ ''اسے رجمنٹ کے ہیڈ کوارٹرز کو لے جاؤ۔''

ہیڈ کوارٹرز گاؤں سے بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ کمپنی کے کمانڈر نے مجھے کاغذات دیے اور میری نگاہوں سے بچتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہیں تمھارے کاغذات ملی شاردا! اپنے لڑکے کو ہیڈ کوارٹرز لے جاؤ۔ وہ تمھارے پاس محفوظ رہے گا۔ اپنے باپ سے تو نہیں بھاگے گا۔''

تب حقیقت مجھ پر بجلی کی طرح کوندی۔ میں نے جان لیا کہ ان کے کھیل کیا ہیں۔ انھوں نے اس لیے مجھے اس کو ہیڈ کوارٹر لے جانے کا حکم دیا تھا کہ میں اس کا باپ ہونے کی وجہ سے اسے یقیناً چھوڑ دوں گا۔ پھر وہ اسے پکڑ لیں گے اور ہم دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیں گے۔ میں اس کمرے میں گیا جہاں ایون قید تھا اور محافظوں سے کہا۔ ''قیدی کو میرے حوالے کر دو اسے ہیڈ کوارٹرز لے جانا ہے۔''

''شوق سے لے جا سکتے ہو۔'' انھوں نے کہا۔ ایون نے اپنا لانبا کوٹ کندھوں پر ڈال لیا۔ ٹوپی کو بے چینی سے سر پر اِدھر اُدھر پھیرا پھر مینچ پر پٹک دیا۔ ہمارا راستہ ایک پہاڑی کی طرف جاتا تھا۔ راستے میں ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ میں بار بار مڑ کر دیکھ رہا تھا کہ کہیں لوگ ہمیں دیکھ تو

نہیں رہے ہیں؟

اس طرح ہم نے شاید آدھی مسافت طے کر لی تھی۔ پھر ہم ایک مقدس مقام سے گزرے۔ اب ہمیں دُور تک کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا۔ ایون میری طرف یہ کہتے ہوئے مڑا۔ اس کی آواز میں کتنا درد تھا کتنی التجا تھی۔ ''ابا! ہیڈ کوارٹرز میں وہ مجھے ضرور مار ڈالیں گے۔ تم مجھے موت کے منھ میں لے جا رہے ہو۔ کیا تمھارا ضمیر اب بھی سو رہا ہے؟''

''نہیں ایواشکا'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ سو نہیں رہا ہے۔''

''تو تمھیں مجھ پر رحم نہیں آتا؟''

''اتنا، میرے بچّے! کہ دل سینے میں غم سے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔''

''پھر اگر تمھیں میرے حال پر رحم آتا ہے تو مجھے چھوڑ دو۔ سوچو اس دُنیا میں میں نے کون سی عمر کاٹی ہے۔'' اس نے اپنے گھٹنے ٹیک دیے۔ تین مرتبہ میرے آگے سر جھکایا۔ اتنا جھکایا کہ وہ زمین سے چھونے لگا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ہم اس ڈھلوان تک چلیں گے، بیٹا! اس کے بعد تم بھاگ جاؤ۔ میں صرف دِکھانے کے لیے تمھارے پیچھے کچھ فیر کر دوں گا۔''

تم جانو جب وہ چھوٹا سا پیار کا ایک لفظ بھی تم اس کے منھ سے نہ سُن سکتے تھے، مگر اب اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری گردن کے گرد پھینک دیے اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

ہم کچھ دُور یونہی چلتے رہے۔ اس نے کوئی بات نہ کی اور نہ میں نے۔ ہم ڈھلان پر پہنچ گئے۔ ایون ٹھہر گیا۔ ''تو خدا حافظ ابا! اگر ہم دونوں زندہ بچ رہے تو پھر میں آخر دم تک تمھیں سہارا دوں گا۔ تم مجھ سے سختی کا ایک لفظ بھی نہیں سُنو گے۔'' وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، میرا دل پھٹا جاتا ہے۔

''بھاگ جاؤ بیٹے!'' میں نے اس سے کہا۔ اس نے ڈھلان پر بھاگنا شروع کیا۔ وہ مڑ مڑ کر مجھے دیکھتا رہا اور ہاتھ ہلاتا رہا۔ میں نے اسے چالیس گز جانے دیا۔ اپنی رائفل نکالی۔ گھوڑا چڑھایا اور کل دبادی۔ گولی ٹھیک اس کی پیٹھ میں لگی۔

مکی شاروا نے اپنی جیب ٹٹول کر تمباکو کی تھیلی نکالی۔ چقماق گھس کر اطمینان سے اپنا

پائپ سلگایا اور منہ سے دھوئیں کے بادل چھوڑنے لگا۔ چقماق اس کی ہتھیلی میں ابھی تک چمک رہا تھا۔ اس کے چہرے کی نسیں کپکپا رہی تھیں۔ سوجے ہوئے پپوٹوں کے نیچے اس کی بھینگی آنکھیں گھور رہی تھیں۔ ان میں سختی تھی پشیمانی نہ تھی۔

وہ ہَوا میں اوپر اُچھلا اور شدّتِ کرب سے بیتاب ہو کر کچھ دُور بھاگا۔ پھر پیٹ پر ہاتھ مارنے لگا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ''ابا...... کیوں؟'' وہ زمین پر گر پڑا اور پاؤں پٹکنے لگا۔ میں دوڑ کر گیا اور اس پر جھک گیا۔ اس کی آنکھیں گھوم رہی تھیں اور منہ سے خون آلود جھاگ نکل رہا تھا۔ میں نے خیال کیا کام تمام ہو چکا ہے۔ وہ مر رہا ہے، لیکن اس نے اپنی پوری طاقت سمیٹ کر میرے ہاتھ کو ٹٹولتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''ابا! میرے ایک بیوی اور بچّہ ہے۔'' اس کا سر ڈھلک گیا۔ وہ زخم ڈھونڈ رہا تھا کہ اسے اُنگلیوں سے بند کر دے۔ زخم کہاں تھا...... مگر اس پر بھی اس کی اُنگلیوں کے بیچ میں سے خون کی دھاریں پھوٹ رہی تھیں۔ پھر وہ پلٹ کر چت لیٹ گیا اور دردناک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ اپنی زبان مشکل سے ہلا سکتا تھا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر میں صرف ''آ۔ با...... آ......!'' سُن سکا۔ اس سے بات کرتے ہوئے میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ ''ایون! میرے بچّے! دُکھ کے اس تاج کو میرے لیے پہن لے۔ مجھے احساس ہے کہ تیرے بھی ایک بیوی بچّہ ہے مگر میرے سات بچّے ہیں جو بے یار و مددگار گھر میں پڑے ہیں۔ اگر میں تجھے چھوڑ دیتا تو کاسکی مجھے ضرور موت کے گھاٹ اُتار دیتے اور میرے بچّوں کو ایک ٹکڑا روٹی کے لیے دربدر بھیک مانگنی پڑتی۔''

وہ تھوڑی دیر تک ہوش میں رہا۔ پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ کو تھامے ہوئے تھا۔ میں نے اس کا اوورکوٹ اور بوٹ اُتار لیے۔ ایک کپڑے سے اس کا چہرہ ڈھانپ دیا اور گاؤں واپس چلا آیا۔

مجھے حقیقت کی آنکھوں سے دیکھو۔ میں نے بچّوں کے لیے یہ دُکھوں کا بوجھ اُٹھایا۔ غم نے میرے بال سفید کر دیے ہیں۔ میں انھیں کی خاطر کام کرتا ہوں کہ وہ روٹی کو نہ ترسیں۔ مجھے سکون نصیب نہیں۔ اور وہ مجھ سے کہتے ہیں میری بیٹی نتاشا کی طرح ''ابا! ہم سے تمھارے ساتھ

کھانے پر نہیں بیٹھا جاتا۔'' کیا کوئی آدمی یہ سہہ سکتا ہے۔

ملی شاردا نے اپنے سر کو جھکایا اور خوفناک نگاہیں مجھ پر گاڑ دیں۔ اس کے پیچھے اُداس قہر آلود ہلکی ہلکی روشنی اُٹھ رہی تھی۔ دریا کے دائیں کنارے سے چناروں کے سیاہ جھنڈ میں ایک آواز سردی اور نیند کے خمار سے بیٹھی ہوئی بطخوں کی بے سُری کو یک کو یک کے درمیان صاف سُنائی دی۔ ''ملی شاردا! تمھارا بُرا ہو۔ فیری او!''

نارویجن کہانی
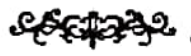
زندگی کا رس

(کنوٹ ہامزون)

نیچے جاتے ہوئے کوپن ہیگن کی بندرگاہ کے قریب ایک گلی ملتی ہے جس کا نام ہے وسٹر وولڈ۔ ایک نئی سُنسان سی گلی۔ یہاں بہت کم گھر ہیں۔ کہیں کہیں گیس لیمپ اور آدمی تو بالکل نظر ہی نہیں آتے۔ ان دنوں، گرمیوں میں بھی شاذ ہی یہاں کوئی سیر کرتا نظر آتا ہے۔

تو کل رات مجھے اس گلی میں ایک عجیب سا واقعہ پیش آیا۔

میں یہاں چہل قدمی کر رہا تھا۔ مقابل کی طرف سے ایک عورت آتی دِکھائی دی۔ آس پاس ایک بھی آدمی نہ تھا۔ گیس لیمپ روشن کر دیے گئے تھے پھر بھی اندھیرا تھا اور میں اس عورت کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ وہی راتوں کو نکلنے والی عورتوں میں سے ہوگی۔ میں نے سوچا۔ اور اس کے پاس سے یونہی گزر گیا۔

گلی کی نکڑ تک جا کر میں پھر مڑ گیا۔ عورت بھی مڑ کر واپس آ رہی تھی۔ ہم دونوں پھر ملے۔ کسی کا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں نے خیال کیا۔ کس کا انتظار کر رہی ہوگی؟ مجھے جاننے کا اشتیاق ہوا لیکن میں اس کے پاس سے یونہی گزر گیا۔

جب ہم تیسری دفعہ ملے تو میں نے ٹوپی اُتار لی۔ اور کہا ''شام بخیر! کسی کے انتظار میں ہیں آپ؟''

وہ چونک پڑی۔ ''نہیں......یعنی......ہاں......انتظار کر رہی ہوں۔''

''اس آدمی کے آنے تک میں آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں؟ آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟''

''نہیں مجھے بالکل اعتراض نہ ہوگا۔ شکریہ'' اس نے کہا۔ ''ویسے میں خصوصیت سے کسی کا

انتظار بھی نہیں کر رہی ہوں۔ یونہی ہوا کھانے چلی آئی۔ یہ پُرسکون جگہ ہے۔"

ہم ساتھ ساتھ ٹہلنے لگے۔ اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں کرتے رہے۔ میں نے اپنا بازو پیش کیا۔

"نہیں شکریہ" اس نے سر ہلا کر کہا۔

یونہی ٹہلنے میں کوئی مزا نہیں آ رہا تھا۔ میں اندھیرے میں اسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے دِیا سلائی جلائی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اب کیا بجا ہے۔ پھر جلتی ہوئی دِیا سلائی کو اُونچا کر کے اس کو بھی دیکھا۔

وہ کپکپا رہی تھی۔ جیسے سردی سے ٹھٹھر رہی ہو۔ میں نے موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔" آپ ٹھٹھر رہی ہیں۔ چلیے ہوٹل میں چل کر کچھ پئیں۔ ٹوالی میں؟ نیشنل میں؟"

"لیکن اس وقت تو میں کہیں نہیں جا سکتی۔ آپ نے شاید غور نہیں کیا۔"

اب میں نے پہلی دفعہ دیکھا۔ وہ ایک سیاہ جالی کا نقاب ڈالے ہوئے تھی۔ میں نے معافی چاہی کہ اندھیرے میں دیکھ نہ سکا تھا۔ اس نے جس طرح میرے عذر کو قبول کر لیا۔ یہ دیکھ کر میں فوراً تاڑ گیا کہ وہ رات کو نکلنے والیوں میں سے نہیں ہے۔

"میرے بازو کا سہارا نہیں لیں گی آپ؟" میں نے پھر جرأت کی۔

"شاید اس سے کچھ گرمی پہنچے۔"

اس نے میرے بازو کا سہارا لے لیا۔ ہم کچھ دیر اِدھر سے اُدھر ٹہلتے رہے۔ اس نے پھر وقت پوچھا۔" دس" میں نے جواب دیا۔

"آپ کہاں رہتی ہیں؟"

"گھا ملے کا نگیوی میں۔"

"میں آپ کو مکان تک پہنچا سکتا ہوں؟"

"نہیں، یہ اچھا نہ ہوگا۔" اس نے جواب دیا۔

"آپ برڈ گیڈ پر رہتے ہیں نا؟"

''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''اوہ، میں جانتی ہوں آپ کون ہیں۔''

ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہم روشن گلیوں میں چلتے رہے۔ وہ جلدی جلدی چل رہی تھی۔ اس کا سیاہ نقاب پیچھے سے اُڑا آ رہا تھا۔

''ہمیں جلدی کرنا چاہیے۔'' وہ بولی۔

گا ملے کا نگیوی میں اپنے دروازے پر رُک کر وہ میری طرف مڑی۔ شاید شکریہ اَدا کرنے کے لیے۔ میں نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ آہستہ سے اندر گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ اندر جا کر اس نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔

تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر ہم تیسری منزل پر آئے۔ اس نے قفل کھولا۔ پھر اندر جا کر ایک اور دروازہ کھولا۔ ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گئی۔ یہ ڈرائینگ روم معلوم ہوتی تھی۔ بڑی گھڑی دیوار پر ٹنگی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ اندر آ کر ایک لمحہ کے لیے وہ یونہی کھڑی رہی۔ پھر میرے گرد بانہیں ڈال کر، مجھے جکڑ کر، کپکپاتے ہوئے جلتے ہوئے ہونٹوں سے میرے ہونٹوں کا بوسہ لیا۔ ہونٹوں کا!

''بیٹھیے یہاں صوفہ ہے۔ میں ابھی لیمپ جلاتی ہوں۔''

وہ لیمپ جلا لائی۔ میں نے حیرت سے اِردگرد کا جائزہ لیا۔ میں ایک کشادہ اور سجی ہوئی ڈرائینگ روم میں تھا۔ اس روم میں کئی دروازے تھے۔ جو اندر دوسرے کمروں میں کھلتے تھے۔ میں بالکل اندازہ نہ لگا سکا۔ آخر میں کس قسم کی عورت کے ساتھ آ گیا ہوں۔

''کتنا خوبصورت کمرہ ہے۔ آپ یہاں رہتی ہیں؟''

''ہاں یہ میرا گھر ہے۔''

''آپ کا گھر؟ تو آپ اپنے والدین کے ساتھ یہاں رہتی ہیں؟''

''او! نہیں۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''میں بوڑھی عورت ہوں۔ آپ ابھی دیکھ لیں گے۔'' پھر اس نے نقاب اُلٹ دیا۔ ''دیکھئے میں نے کہا تھا نا۔'' پھر اچانک میرے گرد اپنے بازو حمائل کر اس نے مجھے جکڑ لیا۔ کسی شدید خواہش سے مغلوب ہو کر۔

میں نے سوچا تھا کہ وہ بیس بائیس برس کی ہوگی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی تھی۔ اس لیے ممکن ہے وہ شادی شدہ بھی ہو۔ خوب صورت؟ نہیں اس کے منہ پر مہاسے تھے۔ بھوؤں کے بال تقریباً ناپید تھے، لیکن اس کے لب بہت خوبصورت تھے اور اس کے انگ انگ سے زندگی پھوٹی پڑتی تھی۔

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ کون ہے؟ اس کا شوہر (اگر اس کا شوہر ہے) کہاں ہے؟ اور میں کس کے گھر میں ہوں؟ لیکن جب بھی میں کچھ پوچھنے کے لیے منہ کھولتا۔ تو وہ مجھے بھینچ لیتی اور زیادہ پوچھ گچھ سے منع کرتی۔

''میرا نام یلن ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''کچھ پیئو گے؟ میں گھنٹی بجاؤں تو کسی کی نیند میں خلل نہ پڑے گا۔ اطمینان رکھیے۔ شاید آپ یہاں بیٹھنا پسند کریں بیڈ روم میں۔ آپ یہاں آجایئے۔''

میں خواب گاہ میں چلا گیا۔ ڈرائینگ روم سے یہاں کچھ روشنی آرہی تھی۔ دو بستر لگے تھے۔ یلن نے گھنٹی بجائی اور شراب منگائی۔ وہ دروازے کے پاس کچھ دیر رُکی۔ میں اس سے ملنے کے لیے چند قدم آگے بڑھا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ پھر وہ خود ہی میرے پاس آ گئی۔ یہ کل شب کا واقعہ تھا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی سورج کی روشنی پردے سے چھن کر آرہی تھی۔ یلن بھی بیدار ہو گئی تھی اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی باہیں سفید اور مخملیں تھیں۔ اور سینہ بھرپور۔ میں نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے اپنے ہونٹوں سے میرے ہونٹ بند کر دیے۔ بڑی نرمی اور محبت سے۔

دن چڑھتا گیا۔ دو گھنٹے بعد میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ یلن بھی اُٹھ کر کپڑے پہننے لگی۔ اس نے شوز بھی پہن لیے۔ اس کے بعد میں نے ایسی چیز دیکھی کہ اب بھی ایسا لگتا ہے کہ میں نے خواب دیکھا تھا۔ یلن کو دوسرے کمرے میں کوئی کام تھا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

کمرے کے بالکل درمیان میں میز پر ایک نعش رکھی ہوئی تھی۔ سفید کفن میں لپٹی ہوئی ایک بوڑھے مرد کی نعش۔ سفید داڑھی، گھٹنے بھنچی ہوئی مٹھیوں کی طرح چادر کے اندر سے نکلے ہوئے تھے۔ چہرہ ہیبت ناک تھا۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس لیے میں نے منہ پھیر لیا۔

جب یلن واپس آئی میں لباس پہن چکا تھا اور باہر جانے کے لیے تیار تھا۔ اب میں اس کے پیار کا جواب دینے سے ہر حال میں قاصر تھا۔ اس نے چند اور کپڑے اوپر سے ڈال لیے۔ وہ مجھے نیچے تک چھوڑ آنا چاہتی تھی۔ دروازے کے پاس وہ دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی تا کہ باہر کے لوگ اسے دیکھ نہ سکیں۔

''خدا حافظ'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کل تک؟'' میں نے یونہی اس کا امتحان لینے کے لیے پوچھا۔

''نہیں، کل نہیں۔''

''کیوں؟''

''اتنے سوال نہ پوچھو۔ میرا ایک رشتہ دار مر گیا ہے۔ کل اس کی تجہیز و تکفین ہے۔ اب سمجھ گئے نا؟''

''لیکن پرسوں؟''

''ہاں پرسوں، میں یہاں ملوں گی۔ اِسی دروازے کے پاس۔ خدا حافظ''

میں چلا آیا۔

وہ کون تھی؟ اور نعش؟ مٹھیاں بھنچی ہوئی۔ ہونٹوں کے کنارے چپکے ہوئے۔ پرسوں وہ میرے آنے کی متوقع رہے گی۔ کیا مجھے جانا چاہیے؟ میں سیدھے بریینا کیفے گیا اور ڈائرکٹری مانگ کر دیکھی۔ گیا ملے کا تگیوی پر وہ نمبر نکالا۔ وہاں اس کا نام تھا۔ میں نے وہیں بیٹھ کر کچھ دیر صبح کے اخباروں کا انتظار کیا۔ اخبار کے ملتے ہی موتوں کی فہرست پر نظر ڈالی۔ فہرست میں سب سے اوپر اسی کا اعلان تھا۔ جلی حروف میں لکھا تھا:

''میرے شوہر ایک طویل عرصہ تک بیمار رہنے کے بعد آج انتقال کر گئے۔ ان کی عمر

ترپن سال کی تھی۔'' اعلان پر پرسوں کی تاریخ تھی۔ میں بہت دیر تک وہاں بیٹھا سوچتا رہا۔ ایک مرد شادی کرتا ہے لیکن اس کی بیوی اس سے تیس سال چھوٹی ہے اور ایک دن وہ مرجاتا ہے۔ اس کی بیوہ آخر کار اطمینان کا سانس لیتی ہے۔

فرانسیسی کہانی

میاں بیوی

(لوئی گیلو)

آنگن سے گزرتے ہی اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں اور وہ وہیں نچلے زینے پر بیٹھی صبح سے رو رہی تھی۔ پینتیس چالیس برس کی یہ عورت، لانبا قد، دُبلا پتلا جسم، کمزور سی، کچھ بیمار سی، وہ زور زور سے سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی اور کچھ مبہم سے الفاظ بڑبڑاتی جاتی تھی۔ گویا وہ ہر پاس سے گزرنے والے کو دھمکیاں دے رہی ہو۔ پڑوسنیں کئی بار اُسے منا چکی تھیں "تمھیں چاہیے کہ اندر چلی جاؤ۔ اتنی چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنانا ٹھیک نہیں۔ یونہی روتی رہوگی تو دردِ سر الگ مول لوگی۔ آخر یوں روتے رہنے سے فائدہ ہی کیا ہے؟"

مگر یہ سب گویا اُس نے سُنا ہی نہیں۔ آخر انھیں اس کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ یہ بوڑھی قطامائیں، کیا اسے اتنی آزادی نہ تھی کہ جو جی میں آئے کرے؟

"اوہ!...... میں کتنی تنگ آ گئی ہوں ان باتوں سے؟" اُس نے سوچا۔ کبھی وہ سونے کی ناکام کوشش میں اپنا سر زینے کی پٹی پر رکھ دیتی، کسی تھکے ماندے مسافر کی طرح کبھی اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپالیتی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ اس کے آنسو کسی نہ سوکھنے والے چشمے سے اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ ایک دبی ہوئی آہ اس کے ہونٹوں سے نکل جاتی، کبھی وہ بالکل خاموش ہو جاتی اور اپنے سامنے بے معنی نگاہوں سے تکنے لگتی۔ پھر کہنی زانو پر ٹیکے ہتھیلی پر رکھے بہت دیر تک وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ وہ اسی انداز سے بیٹھی رہ کر اس کو حیران کر دینا چاہتی تھی۔ یہ اس کے انتقام کا صرف ایک پہلو تھا۔ اسی لمحے جب ان کے جھگڑے نے یہ رنگ اختیار کیا تھا، اسے یہ تجویز سجھائی دی تھی۔

یہ پہلا موقع نہ تھا جب اس نے ان زینوں کو سہارا بنایا تھا۔ یہ رویہ اس کے شوہر کو دیوانہ

بنادیتا تھا اور یہی وہ چاہتی بھی تھی، کیوں؟......شاید وہ خود بھی اچھی طرح نہ جانتی تھی۔

ہاں وہ ضرور اسے دھمکی دے گا کہ اس سے قطع تعلق کر لے گا، وہ اسے مارنے کی دھمکی بھی دے گا، مگر اسے یقین تھا کہ وہ ان دھمکیوں کو بروئے عمل نہیں لائے گا، وہ کچھ بھی کرے مگر اُسے چھوڑے گا کبھی نہیں اور نہ ہی اُس پر ہاتھ اُٹھائے گا۔ یونہی ساتھ ساتھ ان کے دن بسر ہوں گے۔ ان میں سے کسی ایک کے مرنے تک، شاید یہی حقیقت تھی جو اس کو پاگل بنادیتی تھی۔

لوگ سیڑھیاں چڑھتے یا اُترتے ہوئے اس کے پاس رُک جاتے۔ ان میں سے اکثر کی آنکھوں میں رحم کی جھلک ہوتی۔ کچھ حیرت سے تکتے اور بعض کندھوں کو جھٹکاتے ہوئے اس کے پاس سے گزر جاتے، مگر وہ یونہی بیٹھی رہی، حرکت کیے بغیر گویا اس نے کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ اگر کوئی اس کے پاس سے گزرتا ہوا اسے دھکا دے جاتا، اس کا ہاتھ کُچل دیتا، تب بھی شاید وہ یونہی ساکت بیٹھی رہتی، بلکہ وہ خود چاہتی تھی کہ کوئی ایسا کرے۔

پھر کسی نے کہا دوپہر ہو رہی ہے، اب اسے اندر چلی ہی جانا چاہیے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر وہ کیوں جواب دیتی؟ کیا وہ اس لیے وہاں بیٹھی تھی کہ لوگوں کی باتیں سُنے اور ان کی ہر بات کا جواب دیتی رہے، کیا وہ اسی لیے وہاں بیٹھی تھی کہ لوگ اسے دیکھیں اور اچھی طرح جان لیں کہ اس نے اس کی زندگی کو کس قدر تلخ بنا رکھا ہے اور اس کے شوہر کو معلوم ہو جائے کہ لوگوں نے بھی اُسے دیکھ لیا ہے اور وہ سب کچھ جان چکے ہیں۔ ہاں وہ یہی چاہتی تھی۔ اگر لوگ اسے نصیحت کرتے یا تسلی دیتے تو اس کے جواب میں وہ صرف رونے لگتی۔

جھگڑا سویرے ہی شروع ہوا تھا اور وہ صبح آٹھ بجے سے وہیں سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی طاقت اسے وہاں سے ہٹا نہ سکتی تھی۔ گھڑی نے بارہ بجائے، کوئی دم میں وہ آجائے گا۔ آخر وہ کہے گا کیا؟ شاید جیسے اس نے پچھلی مرتبہ کیا تھا۔ اس پر نظر ڈالے بغیر ہی گزر جائے گا، مگر وہ زیادہ دیر تک فلیٹ میں تنہا تو نہیں رہ سکتا تھا۔ پچھلی بار جب ایسی ہی لڑائی ہوئی تھی تو پندرہ منٹ سے زیادہ نہ رہ سکا تھا اور اسے ڈھونڈتا ہوا آ پہنچا تھا۔ آج بھی بے شک یونہی ہوگا۔

وہ انتہائی غصّے کی حالت میں گھر سے نکلا تھا، دھماکے سے کواڑ بند کرتے ہوئے قسم کھائی

تھی" یہ آخری بار ہے، تم نے سُنا، آخری بار، کہ میں اس قسم کے پاگل پن کو برداشت کر رہا ہوں۔"
مگر اسے دفتر میں بہت سا وقت ملے گا۔ وہ صبح کے واقعات پر پھر غور کرے گا اور اس کا غصہ یقیناً ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

صحن کا دروازہ کھلا۔ عورت نے اس کے قدموں کی آہٹ پہچان لی۔ اس کی ایک نس بھی نہ کانپی، گو وہ ہمہ تن گوش بن گئی تھی اور ان مانوس قدموں کی آواز سُننے کے لیے اس کے جسم کا ہر عضو دفعتاً ساکت ہو گیا تھا، لیکن بظاہر وہ یوں بے حس دِکھائی دیتی تھی جیسے اس کے گرد جو کچھ ہو رہا ہے اس کا اسے احساس ہی نہیں۔ قدموں کی چاپ نزدیک آتی گئی۔ وہ کچھ ہی دیر میں اسے دیکھ لے گی تاہم وہ یونہی بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اس کا سر پٹی پر رکھا ہوا تھا اور آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ مجسم انتظار بنی ہوئی تھی۔

وہ اس سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا اور گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایسے واقعات کا اس نے پہلے بھی سامنا کیا تھا لیکن ہر دفعہ کوئی نت نرالی لگی رہتی تھی۔

وہ کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے کھڑا رہا۔ وہ ایک معمولی کلرک تھا۔ عمر کوئی پچاس سال کی ہو گی۔ اس کے گھنی گھنی مونچھیں تھیں اور وہ موٹا سا بے ڈول آدمی تھا۔

"تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟" اس نے آہستہ سے کہا۔ اس کی آواز میں نرمی تھی، غصہ نہ تھا۔ عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کسی خوف سے سہم گیا۔ اسے محسوس ہوا اس کا خون خشک ہوا جا رہا ہے اور اس کے ہاتھ جو چھتری کو تھامے ہوئے تھے کانپنے لگے۔ اس کے دل میں اپنے آپ پر حقارت کا جذبہ اُمڈ آیا اور ندامت کی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی، مگر اس کے احساسات میں رحم کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ وہ بہت دیر تک وہیں خاموش کھڑا رہا۔ روشنی باہر سے داخل ہوتی تھی اس لیے اس کے چہرے کے نقوش اچھی طرح دِکھائی نہ دیتے تھے، صرف ایک پرچھائیں تھیں، گوشت پوست کا ایک تودا۔

اس نے پھر نرمی سے پوچھا "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

عورت نے اپنی جذبات سے ماری آنکھیں اُٹھائیں اور اس کے آر پار گھورنے لگی۔ ان

نگاہوں میں اتنی گرمی تھی کہ اس کے شوہر نے تاب نہ لا کر آنکھیں پھیر لیں اور چھتری اس کے ہاتھوں سے گر پڑی۔

اس نے پھر پوچھا ''تم کب سے یہاں بیٹھی ہو؟''

جواب ندارد۔ تُف ہے ایسی زندگی پر، اس نے سوچا اور بیزاری سے کندھے جھٹکائے۔ تو......تو یہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ سارا دن وہ آفس میں اس گھریلو لڑائی کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ پر ملامت کی تھی مگر اُسے پھر بھی اُمید تھی کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔

''کیا تم نے یہیں بیٹھنے کی ٹھان لی ہے؟''

اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔ اس کے لہجے سے پتہ چلا تھا کہ غصہ اس پر قابو پا رہا ہے۔ اس نے احتیاط کرنے کی کوشش کی کیونکہ غصہ اُسے بے حد تھکا دیتا تھا۔

''چلی آؤ، اُوپر چلیں۔ یہ سراسر بیوقوفی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

لفظ بیوقوفی پر ایک ایسی خشمگیں نگاہ اُس پر پڑی کہ وہ کانپ گیا۔ اس نے ایک سرد آہ بھری۔ کیا زندگی تھی یہ بھی!......اور یہ سب کچھ کس لیے۔ پھر وہ عورت کی طرف دیکھنے لگا۔ ''آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے؟'' یہ سوال یا دوسرا کوئی سوال دونوں برابر تھے، کیونکہ جواب ملنے کی تو کوئی اُمید نہ تھی۔

''بھاڑ میں جائے، مجھے کیا؟'' وہ چلّایا۔

ابھی وہ ایک سیڑھیاں ہی چڑھا تھا کہ یکا یک وہ گھوم کر پلٹا۔

وہ چونک پڑی!

''اور بچّی کہاں ہے؟''

وہ آگے کو جھک گیا۔ اس کی گرم سانس عورت کے بالوں کو چھونے لگی۔ اس نے بچّی کی ذرہ بھر پروا نہیں کی تھی۔ بچّی کو کچھ دیر کے لیے بھول جانا بھی بے شک اس کے انتقام کا ایک حصہ تھا مگر اسے یہ خیال نہ آیا تھا کہ اس بات کا اُسے خود ناتارنج پہنچے گا۔

''کہاں چھوڑ آئی ہو بچّی کو؟ ......سُنا تم نے۔'' وہ گرجا۔ عورت ڈری کہ اب مار پڑے

گی۔اس کا سر چکرانے لگا۔اس نے واقعی اپنی بچّی کا خیال نہ رکھا تھا اور اسے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی۔

''جواب نہیں دوگی؟'' اب وہ غصّے میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔تیزی سے سیڑھیاں اُترتا وہ اس کے بالکل سامنے آکھڑا ہوا۔عورت کا سر نیچے جھک گیا۔اس نے چھتری کو دیوار سے لگا کر رکھا اور ہاتھ بڑھا کر اندھوں کی طرح عورت کے چھپے ہوئے چہرے کو ٹٹولا۔

''کب تک آخر کب تک یونہی اذیت دیتی رہوگی؟'' اُس نے دبی آواز میں کہا......

''کب تک' اوہ میرے خدا!''

اس کی رُوح کو ناقابلِ برداشت تکلیف پہنچ رہی تھی۔یکا یک اسے وہ رات یاد آئی جب وہ گھر سے بھاگ نکلی تھی اور اس نے گھنٹوں اس کی تلاش کی تھی۔اس خوف سے کہ کہیں وہ دریا میں نہ کود پڑے۔

''بولو، بولو بھی'' اس نے عورت کی تھوڑی پکڑ کر آہستہ آہستہ اس کا چہرہ اُوپر اُٹھایا۔اب اسے اس پر ترس آنے لگا۔

''تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟'' عورت کے ہونٹ کانپے۔وہ اور زیادہ جھک گیا۔نہیں معلوم اس کے کانوں نے کیا سُنا۔اس نے پوچھا ''کیا کہا تم نے؟''

''کچھ نہیں'' عورت نے جواب دیا اور پھر سب کچھ بدل گیا۔

''کچھ نہیں؟'' وہ چلّایا۔''واقعی؟ تو پھر، آخر کیوں؟......آخر کیوں؟؟......خدارا مجھے بتلاؤ، آخر تم نے یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے، بچّی کو کہاں چھوڑ آئی ہو؟'' وہ چیختا ہوا اُسے زور زور سے ہلانے لگا۔اس کا چہرہ غصّے سے تمتما رہا تھا۔خلافِ توقع غصہ اُس پر بخار کی طرح چڑھ رہا تھا۔

یہ غصہ، یہ طوفان، پھر ندامت، پریشانی، یہ جذبات کا تغیّر، یہ تبدیلیاں، رحم وشفقت پھر وحشت، فیض وغضب یہ سب کچھ کتنا ڈرامائی تھا؟

کہیں اُوپر والی منزل سے ایک آواز آئی۔''بچّی ہمارے پاس ہے گھبرایئے نہیں، ہم اسے دوپہر کا کھانا کھلا دیں گے۔''

اُس نے جواب دیا، گویا یہ سُن کر اس کے سر سے ایک بوجھ اُتر چکا تھا۔

تو..... ہمسائیاں بھی سب کچھ سُن چکی تھیں، کتنی شرم کی بات تھی۔

''نہیں سُنا آپ نے؟'' اُوپر سے پھر آواز آئی۔

اُس نے چلاّ کر کہا ''ہاں بھئی سُن لیا۔ شکریہ آپ کی مہربانی۔'' اور غیرارادری طور پر چھتری اُٹھالی۔

''آہ میں تنگ آ گیا ہوں، تنگ آ گیا ہوں'' وہ بڑبڑایا۔

اس کی بیوی نے مڑ کر دیکھا۔ اندرونی جذبات اس کے چہرے سے عیاں تھے۔ گو اس کی آنکھیں خشک تھیں اسے بھی یہ سُن کر بچّی محفوظ ہے اطمینان ہو گیا تھا۔

''تنگ آ گئے ہو؟..... کس بات سے تنگ آ گئے ہو؟'' اُس نے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اس کا سر مارے درد کے پھٹا جارہا تھا۔ شاید اب کی دفعہ اس کے شوہر نے بھی خاموش رہنے کی ٹھان لی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''ہاں، میں جواب کا انتظار کر رہی ہوں۔''

''بھئی میں ان روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ گیا ہوں۔''

''ہاں، تو ان لڑائیوں کی ذمہ دار میں ہوں؟''

''نہیں تم نہیں، وہ قصائی کا لڑکا۔''

قریب تھا کہ وہ ہنس پڑے، کیونکہ جواب ہی اس قدر مضحکہ خیز تھا، مگر وہ ہنسی نہیں۔

''جس طرح میرے دن بیت رہے ہیں، اس کی تمھیں کیا پروا؟'' عورت نے گلہ کیا۔ وہ بے پروا نہ تھا۔ اس کے برخلاف اس کے لیے یہ بہت اہم بات تھی لیکن پھر بھی۔

عورت نے ایک آہ بھری۔ پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ بھول چکا تھا کہ وہ ابھی تک زینوں ہی پر ہے اور یہ بھی بھول چکا تھا کہ وہ بھوکا ہے۔ قرائن سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی چیز پکائی نہیں گئی ہے۔ اسے جھگڑا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن وہ پھر بھی اس مخمصے میں پھنس گیا۔

اس نے کہنا شروع کیا کہ اسے خود کتنی تکلیف پہنچی ہے۔ دراصل وہ اس سے کتنی محبت کرتا

ہے، اس بات کا یقین دلانے کے لیے وہ بے تاب تھا۔

''تم نہیں دیکھتیں کہ یہ سب کیسی بے وقوفی ہے۔ اتنا وقت بیکار ضائع گیا۔ ان جھگڑوں کے بغیر بھی زندگی کی پیچیدگیاں کیا کم ہیں؟......تو پھر کیوں؟...... یہ سب آخر کس لیے...... بولو'' اس نے اپنے ہاتھ عورت کے کندھے پر رکھے اور اس کو اپنے قریب کھینچ لیا۔''تو، اب یہ کھیل ختم ہو چکا سمجھیں؟''

عورت نے اپنا گال اُس کے گال پر رکھ دیا اور رونے لگی۔

''دیکھو نا، اب ختم کرو یہ رونا دھونا، اب تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔'' اُس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ یہ نرم محبت آمیز جملہ، گویا عورت کی تمام کوششوں کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ اپنے شوہر کی زبان سے یہ الفاظ سُنے۔ اب وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔

''ہنری!'' اُس نے اپنے شوہر پر محبت بھری نگاہ ڈالی، ہنری نے اس کے گال پر ہلکی سی تھپکی دی۔''آؤ اُوپر چلیں۔''

''نہیں وہ جہاں ہے وہیں اچھی ہے۔''

فلیٹ میں ہر چیز بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھی۔ بچھونا تک برابر نہیں کیا گیا تھا۔ کھڑکیاں بھی بند تھیں، کمروں میں تاریکی تھی اور ان میں رات کی بُو بسی ہوئی تھی۔ ہنری نے اپنی ہیٹ اُتاری۔ کچھ دیر یونہی ہاتھوں میں پکڑے سوچتا رہا کہ اسے کہاں رکھا جائے۔ آخر اس نے ہیٹ کو چھتری کے پاس کرسی پر رکھ دیا۔

''ہاں۔'' اس نے عورت کی طرف دیکھ کر کہا جو کمرے کے بیچ میں کھڑی تھی۔

''ہاں کیا؟'' اُس نے بچے کی طرح منہ بنایا گویا پھر رونا شروع کر دے گی اور پیشانی پونچھنے لگی۔

''یقیناً یہ پھر شروع نہیں ہوگا، تمھارے سر میں درد تو نہیں ہے؟''

''ہاں شدید'' اُسے تعجب نہ ہوا، اسی نے تو یہ بیماری مول لی تھی۔

''تو اب ہو چکا ختم؟''

''ہاں ختم ہو چکا'' عورت نے جواب دیا۔ اس کی آواز دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی۔
ہنری نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور آہستہ سے بھینچا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکالے، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس وقت خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ پھر بھی اس نے باتیں کرنا شروع کیا۔

''تم ایسا کیوں کرتی ہو؟'' اُس نے نرمی سے پوچھا۔ ''کیوں؟''

''اور تم ہم دو ہیں ایک نہیں...... صرف ایک کا قصور ہوتا۔''

مگر اس نے بات کاٹ کر کہا ''ہم میں سے کوئی بھی قصوروار نہیں۔''

''یہی تو'' عورت بولی ''یہی بات ہے، کچھ بھی ہو ہمارے دل میں کھوٹ نہیں ہے۔''

''بالکل نہیں'' عورت نے جلدی سے جواب دیا۔ ''تمھیں یاد ہے یہ سب کچھ کس لیے ہوا؟''

''مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔ صرف چند الفاظ تھے اور الفاظ تو کچھ اہمیت نہیں رکھتے، میں انھیں قطعی بھول چکا ہوں سمجھ میں نہیں آتا یہ جھگڑا کیوں اُٹھ کھڑا ہوا؟''

''اب بھول بھی جاؤ'' عورت بولی۔

بازوؤں کی گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ ہنری دُور ہٹ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک کرسی پر گرا دیا۔ غصہ اس پر پھر چڑھ رہا تھا۔ ''تم بھی عجیب ہو'' وہ چلّایا ''کیا تم نے صبح کا اخبار پڑھا؟''

کیا عجیب سوال تھا، جیسے اخبار کا خیال بھی آیا ہو۔

''ہاں سچ ہی تو کہہ رہا ہوں۔''

''میں جانتی ہوں۔''

وہ پھر برس پڑا۔ ''تم اچھی طرح جانتی ہو۔ تو تمھارا ان سیڑھیوں پر بیٹھے رہنے سے کیا مطلب ہے؟ اس طرح روتی بسورتی خدا جانے کس بات پر؟''

''اوہ، خاموش ہو جاؤ خدا کے لیے!''

وہ آپ ہی آپ چپ ہو گیا۔ اس نے صبح کے واقعات سوچتے ہوئے اپنی بیوی کی طرف

دیکھا تو اُسے محسوس ہوا اُسے اپنی بیوی سے نفرت ہے۔ ہاں سچ مچ۔ واقعی، اس سے نفرت ہے اور وہ اس قسم کے تریا چلتروں سے سخت بیزار تھا۔

''کچھ پکا بھی ہے، آخر ہم کھائیں گے کیا؟'' اُس نے گھڑی جیب سے نکالتے ہوئے پوچھا۔ ''ساڑھے بارہ ہو چکے ہیں۔''

''انڈے تل لوں گی اور ساگ ترکاری کافی ہے ہاں؟'' وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

ہنری بستر پر دراز ہو گیا۔ یہ سب کچھ..... آخر صبح اس نے کیا کہا تھا جو اس کی بیوی کو اتنا بُرا لگا۔ اس نے دماغ پر بہتیرا زور دیا لیکن بے سود۔ وہ اندر بیٹھی انڈے پھینٹ رہی تھی کہ یکا یک ہنری نے آواز دی۔

''مارسیل!''

''جی!'' اُس نے ہاتھ روکتے ہوئے جواب دیا۔

''میں نے صبح تم سے کیا کہا تھا۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی ''کچھ نہیں''

''ہاں ہاں، کہونا''

''اس سے کیا فائدہ؟''

''میں یونہی جاننا چاہتا تھا۔''

''وہ پھر دُہرانے کے قابل نہیں۔'' وہ ہنوز جواب کا انتظار کرتا رہا۔ وہ کیوں بتانا نہیں چاہتی تھی؟ وہ جاننے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ یہ کس قدر تعجب خیز بات تھی کہ اُسے خود یاد نہیں آ رہا تھا۔

''تمھیں یاد نہیں مارسیل، تم مجھے تو بتلاؤ نا۔''

''کیوں بتاؤں؟'' ہم پھر سے اس جھگڑے کو شروع تو نہیں کریں گے، یہ صریحاً بے وقوفی ہے۔ اسے یقین ہو گیا وہ نہیں بتائے گی۔

''اچھا یونہی سہی'' وہ گنگنایا۔ ''آخر جاننے سے کیا فائدہ؟..... نہ جاننا ہی بہتر ہے۔''

جرمن کہانیاں

موٹی بچّی

(ماری لوئیزے کاشنٹز)

جنوری کے آخری دن تھے اور کرسمس کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ جب وہ موٹی بچی میرے پاس آئی۔ اس موسمِ سرما میں، میں نے ہمسایہ بچّوں کو اپنی کتابیں عاریتاً دینی شروع کی تھیں جنھیں پڑھنے کے بعد وہ واپس کر جاتے تھے اور پھر نئی کتابیں لے جاتے تھے۔ اس کے لیے میں نے ہفتے کا ایک خاص دن مقرر کر رکھا تھا۔ ان میں سے اکثر بچّوں کو میں جانتی تھی، لیکن بعض اجنبی بچّے بھی، جو دوسری گلیوں میں رہتے تھے، کبھی کبھی آجایا کرتے تھے۔ اکثر بچّے کتابیں لے کر فوراً چلے جاتے، لیکن چند بچّے وہیں، میرے گھر پر، ایک جگہ بیٹھ کر پڑھنے لگتے۔ میں اپنے ڈیسک پر اپنا کام کر رہی ہوتی اور بچّے کتابوں کے شیلفوں کے پاس چھوٹی میز کے گرد بیٹھ کر کتابیں پڑھ رہے ہوتے۔ ان بچّوں کی موجودگی سے میرے کام میں ہرج نہ ہوتا بلکہ ان کی موجودگی میرے لیے فرحت کا باعث ہوتی۔

وہ موٹی بچّی جمعہ یا ہفتے کے روز میرے ہاں آئی۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کون سا دن تھا، بہرحال یہ وہ دن نہیں تھا جس دن میں کتابیں دیا کرتی تھی۔ اس وقت میں باہر جانے کی تیاری کر رہی تھی اور اپنا مختصر سا کھانا کمرے میں لا رہی تھی۔ اس سے پہلے بھی کوئی مجھ سے ملنے آیا تھا اور غالباً وہ بھولے سے دروازہ کھلا چھوڑ گیا تھا۔ جب میں بڑی میز پر کھانا رکھ کر باورچی خانے سے کچھ اور لانے کے لیے مڑ رہی تھی تو وہ بچّی اچانک میرے رُوبرو آ کھڑی ہوئی۔

بچّی کی عمر یہی کوئی بارہ سال کی ہوگی۔ وہ ایک پُرانے فیشن کا اُونی کوٹ پہنے ہوئے تھی اور اس کے پاؤں میں ہاتھ کی بُنی ہوئی موٹی موٹی جرابیں تھیں۔ اپنے ہاتھوں میں وہ آئس سکیٹس پکڑے ہوئے تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میں اس سے مانوس ہوں۔ وہ اجنبی ہے، بلکہ

اس کے یوں چپکے سے چلے آنے سے مجھے ڈر سا لگا۔

''اس سے پہلے بھی کبھی تم یہاں آئی ہو؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

موٹی بچّی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش کھڑی رہی اور دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھے مجھے گھورتی رہی۔ اس کی آنکھیں بڑی شفاف تھیں۔ جھیل کے پانی کی طرح شفاف!

''تمھیں کوئی کتاب چاہیے؟''

اس پر بھی بچّی نے کوئی جواب نہ دیا اور مجھے کوئی تعجب بھی نہ ہوا۔ میں ایسے بچّوں کی عادی ہو چکی تھی جو شرمیلے تھے۔ بولتے ہوئے جھجکتے تھے اور میں خود کتابوں کے انتخاب میں ان کی مدد کیا کرتی تھی۔ چنانچہ میں نے چند کتابیں نکالیں اور بچّی کے سامنے رکھ دیں۔

پھر اس کے لیے میں نے ایک لائبریری کارڈ نکالا اور خود ہی خانہ پُر کرنے لگی۔

''تمھارا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے موٹی کہتے ہیں۔'' بچّی نے کہا۔

''میں بھی تمھیں موٹی کہوں؟'' میں نے مسکرا کر سوال کیا۔

''کہیے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' بچّی نے کہا۔ لیکن اس نے میری مسکراہٹ کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ اب مجھے یاد آتا ہے کہ اس لمحے بچّی کے چہرے پر درد کا ایک سایہ سا گزر گیا تھا۔ لیکن اس وقت میں نے اس کا جائزہ نہیں لیا۔

''تم کب پیدا ہوئیں؟'' میں نے آگے سوال کیا۔

''اکو یریس میں۔'' بچّی نے دل جمعی سے جواب دیا۔

اس جواب سے میں بہت محظوظ ہوئی اور مذاق کے طور پر کارڈ میں یہی درج کر دیا۔ اب میں کتابوں کی طرف آئی۔

''تمھیں کوئی خاص کتاب چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔

اور تب میں نے دیکھا کہ وہ بچّی کتابوں کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ بلکہ اُس کی نگاہیں اس ٹرے پر مرکوز تھیں جس میں سینڈوچ اور چائے رکھی تھی۔

''غالباً تمھیں کچھ کھانے کے لیے چاہیے؟''میں نے جلدی سے موضوع بدلا۔

بچّی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہاں کرتے ہوئے اس کے چہرے پر تعجب کا اظہار تھا کہ اس سے پہلے مجھے اس کا خیال کیوں نہیں آیا؟ بچّی سینڈوچز کھانے لگی۔ ایک کے بعد دوسرا۔ وہ کچھ ایسے حریص انداز سے کھا رہی تھی جیسے سالوں کی بھوکی ہو۔ سینڈوچ ختم کرنے کے بعد وہ پھر بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ اور اپنی تھکی ہوئی سرد مہر آنکھوں سے مجھے گھورنے لگی۔

اس بچّی کے حُلیے، رنگ ڈھنگ، وضع قطع اور انداز میں کوئی ایسی بات تھی جو مجھ میں ایک چڑ سی، بلکہ نفرت سی پیدا کر رہی تھی۔ بلکہ شروع ہی سے اس بچّی کے لیے میرے دل میں نفرت پیدا ہو چلی تھی۔ اس کی ہر بات مجھے بُری لگ رہی تھی۔ اس کی سُست، بے ڈھنگی حرکات، اس کی اچھی خاصی، مگر بہت موٹی شکل وصورت، اس کے بات کرنے کا طریقہ، جیسے وہ نیم خوابی کی کیفیت میں ہو۔ گو میں اس بچّی کی وجہ سے باہر جانے کا ارادہ ترک کر چکی تھی۔ پھر بھی اس کے ساتھ سرد مہری کا برتاؤ کر رہی تھی۔

یعنی یہ دوستانہ سلوک نہ تھا کہ میں اپنے ڈیسک پر جا بیٹھی۔ اپنے کام کے کاغذات باہر نکال لیے اور اس کی جانب ذرا سا مُڑ کر بے پروائی سے کہا۔ ''اب تم کتابیں پڑھو۔'' حالانکہ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ پڑھنا نہیں چاہتی اور میں تھی کہ وہاں ڈیسک پر بیٹھی کچھ لکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور لکھ نہیں پا رہی تھی۔ میرے وجود کے اندر کچھ عجیب سی اذیّت اور کشمکش تھی جیسے میں کچھ پہچاننا چاہ رہی ہوں اور پہچان نہیں پا رہی ہوں۔ اور جب تک پہچان نہ لوں میرے لیے کوئی کام کرنا مشکل ہوگا۔

میں کچھ دیر تو برداشت کرتی رہی۔ پھر مڑ کر اس بچّی سے گفتگو کرنے لگی۔

''کیا تمھارے کوئی اور بھائی بہن ہیں؟''میں نے پوچھا۔

''ہاں، ہے۔''اس نے جواب دیا۔

''تم اسکول جانا پسند کرتی ہو؟''

''ہاں۔''بچّی نے جواب دیا۔

''تمھیں سب سے زیادہ کیا پسند ہے؟''

''یعنی کیا؟'' بچّی نے سوال کیا۔

''مثلاً کون سا موضوع تمھیں پسند ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اُس نے کہا۔

''غالباً جرمن زبان پسند کرتی ہو؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' بچّی نے پھر وہی دہرایا۔

میں اپنی پنسل اُنگلیوں میں مسل رہی تھی۔ میرے اندر ایک عجیب سا جذبہ، عجیب سا خوف اُبھر رہا تھا۔ جو محض اس بچّی کو دیکھ کر پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا۔

''تمھاری سہیلیاں ہیں؟'' میں نے پھر پوچھا۔ اب میں کانپ رہی تھی۔

''ہاں، ہیں۔'' بچّی نے اسی بے اعتنائی سے جواب دیا۔

''ان سہیلیوں میں سے کوئی ایک تمھیں بہت اچھی لگتی ہوگی؟''

''مجھے پتہ نہیں۔'' اس نے پھر کہا۔ وہ بالوں والا اُونی کوٹ پہنے ایک موٹے کیڑے کی طرح لگ رہی تھی۔ اس نے کھایا بھی کیڑے کی طرح تھا اور اب پھر کیڑے کی مانند کُلبلا رہی تھی۔

اب تمھیں کچھ نہ ملے گا۔ میں نے دل میں کہا۔ میں اس سے گویا انتقام لینا چاہتی تھی۔ پھر بھی میں اُٹھ کر اندر گئی اور اس کے لیے روٹی اور سیاسج لے آئی۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے گھورنے لگی۔ اس کا چہرہ کسی جذبے سے عاری تھا۔ کھانا سامنے آتے ہی پھر وہ کیڑے کی طرح کھانے لگی۔ آہستہ آہستہ، بڑے انہماک سے، وہ کھاتی رہی اور میں بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ خاموشی سے، نفرت سے۔

اب میری یہ حالت تھی کہ اس بچّی سے وابستہ ہر چیز سے مجھے چڑ ہو رہی تھی۔ کیا واہیات کوٹ ہے اور کتنا مضحکہ خیز کالر، میں نے سوچا کھانے کے بعد وہ اپنے کوٹ کے بٹن لگانے لگی تو میں اپنے کام میں لگ گئی۔ اتنے میں بچّی کے ہونٹ چاٹنے کی آواز آئی۔ اس کے ہونٹوں سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے گھنی جھاڑیوں میں کوئی گہرا تالاب ہو اور اس تالاب میں بُلبلے پھٹ رہے

ہوں۔ اس آواز کو سُن کر مجھے انسانی فطرت کی مایوسی اور انسانی زندگی کے بوجھ کا احساس ہوا اور مجھ پر گہری افسردگی چھا گئی۔

تم آخر مجھ سے چاہتی کیا ہو؟ چلی جاؤ۔ یہاں سے چلی جاؤ...... میں اس سے کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہ سکی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دوں۔ اسے ہانک دوں جیسے وہ کوئی جانور ہو۔ لیکن میں نے یہ کہا نہیں اور بجائے اس کے میں پھر اس سے باتیں کرنے لگی۔ سرد مہری اور سختی کے ساتھ اس سے سوالات کرنے لگی۔

''تم اس وقت برف پر جاؤ گی؟''

''ہاں'' موٹی بچی نے کہا۔

''تم اچھی سکیٹر ہو؟'' میں نے ان سکیٹس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جنھیں وہ چمڑے کے فیتے سے لٹکائے ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھی۔

''میری بہن اچھا سکیٹ کرتی ہے۔'' بچی نے کہا اور پھر اس کے چہرے پر اذیت اور دُکھ کا سایہ گزر گیا۔ حالانکہ اس وقت بھی میں نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔

''تمھاری بہن کیسی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''تم جیسی ہے؟''

''او، بالکل نہیں۔'' موٹی بچی نے کہا۔ ''وہ دُبلی پتلی نازک سی ہے اور اس کے گہرے رنگ کے گھنگھریالے بال ہیں۔ جب ہم گاؤں کی کھلی فضا میں گرمیاں گزارنے جاتے ہیں تو میری بہن اکثر راتیں جاگ کر گزارتی ہے۔ جب کبھی آندھی آتی ہے یا مینہ برستا ہے تو وہ اوپر بالکونی میں جا کر گیت گانے لگتی ہے۔''

''اور تم؟'' میں نے پوچھا۔

''میں؟ میں بچھونے میں دبک کر پڑی رہتی ہوں۔ آندھی سے ڈر لگتا ہے۔''

''اور تمھاری بہن نہیں ڈرتی؟''

''نہیں۔ اسے کسی بات سے خوف نہیں آتا۔ وہ نہانے کے تالاب کے سب سے اُونچے تختے سے پانی میں چھلانگ لگاتی ہے۔ سر کے بل پانی کے اندر چلی جاتی ہے۔ گہرے پانی میں

ڈبکیاں لگاتی ہے اور بہت دور تک تیرتی چلی جاتی ہے۔''

''اچھا، تمھاری بہن کون سے گیت گاتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جو جی میں آئے۔ وہ نظمیں بھی لکھتی ہے۔'' بچّی نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''اور تم؟'' میں نے پوچھا۔

''میں؟ میں کچھ بھی نہیں کرتی۔'' اُس نے کہا۔ پھر وہ اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں اب جاؤں گی۔''

میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے اپنی موٹی اُنگلیاں میرے ہاتھ میں دے دیں۔ اس وقت جانے میں کیا محسوس کر رہی تھی۔ ایک چیلنج سا کہ میں اِس بچّی کا پیچھا کروں؟ کوئی اندرونی آواز مجھے کھینچ رہی تھی۔

''اچھا پھر آنا۔'' میں نے اس سے کہا۔ حالانکہ میں یہ نہیں چاہتی تھی۔ بچّی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی خالی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔

اور پھر وہ چلی گئی۔ اس کے جانے پر مجھے اطمینان کا احساس ہونا چاہیے تھا۔ لیکن میں بے چین ہوگئی اور جیسے ہی باہر کا دروازہ بند ہوا، میں بھاگ کر کاریڈور میں پہنچی، جلدی سے کوٹ پہنا اور تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر گلی میں پہنچی۔ اس وقت وہ گلی کے نکڑ پر مُڑ رہی تھی۔ میں اس کے پیچھے ہولی۔

دیکھنا چاہیے کہ یہ کیڑا نما بچّی سکیٹ کس طرح کرتی ہے۔ میں نے سوچا اور یہ موٹی گول مٹول سی برف پر کیسے لڑھکتی ہے۔ میں تیز تیز قدم بڑھانے لگی کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔

وہ بچّی دوپہر کے وقت میرے گھر آئی تھی اور اب شام کا جھٹپٹا پھیلنے لگا تھا۔ گو میں نے بچپن کے کئی سال اس شہر میں گزارے تھے لیکن میں ان راستوں سے اچھی طرح باخبر نہ تھی۔ اس بچّی کا پیچھا کرنے کی کوشش میں، میں ایسی جگہ نکل آئی تھی جو میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ یہ گلی کوچے، چوک اور راستے اجنبی سے لگ رہے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے محسوس کیا کہ اچانک ہوا

اور فضا میں تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ پہلے سخت سردی پڑ رہی تھی اور اب برف کو پگھلا دینے والی حرارت تھی۔ اتنی شدید کہ چھتوں پر سے برف پگھل پگھل کر ٹپک رہی تھی اور آسمان پر کالی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔

اب ہم شہر سے باہر نکل آئے تھے۔ جہاں بڑے بڑے لانوں اور بغیچوں سے گھرے ہوئے بنگلے تھے۔ اب یہ بنگلے بھی دُور ہوتے گئے۔ آبادی ختم ہوگئی اور یہاں پہنچ کر وہ بچی اچانک ایک گہرے ڈھلان میں غائب ہوگئی۔ اگر میں نے یہ تصور کیا تھا کہ اس ڈھلان کے پرے کوئی سکیٹنگ ونگ ہوگی جہاں سٹالوں کی روشنیاں چمک ہوں گی۔ آرک لیمپ جگ مگ کر رہے ہوں گے اور برف کی روشن سطح ہوگی، جہاں شور ہوگا اور موسیقی ہوگی، تو یہ میری غلطی تھی۔ یہاں تو ایک دوسرا ہی منظر تھا۔ یہاں میرے نیچے، نشیب میں ایک جھیل تھی، گھنی جھاڑیوں میں گھری ہوئی۔ یہ جھیل اور یہ جگہ بالکل ایسی دکھائی دے رہی تھی جیسے میں نے بچپن میں دیکھی تھی۔

یہ غیر متوقع منظر دیکھ کر میں کچھ ایسی کھوئی کہ اس بچی کو نظر میں رکھنا بھول گئی۔ لیکن کچھ دیر بعد وہ مجھے پھر نظر آئی۔ اب وہ جھیل کے کنارے بیٹھی تھی اور ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھے اپنے پاؤں میں سکیٹس پہننے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے سکیٹس پاؤں پر جمائے، دوسرے ہاتھ سے سکیٹس کی چابی لگا رہی تھی۔ چابی بار بار اس کے ہاتھوں سے گر جاتی تھی اور وہ برف پر دوزانو جھکی، چابی تلاش کرتی ہوئی مینڈک سی لگ رہی تھی۔

تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ جھیل میں آگے کو نکلی ہوئی جیٹی بچی سے صرف چند قدم دُور تھی۔ جیٹی کی سیاہی برف کی سیمیں سفیدی پر اُبھر آئی تھی۔ برف کی سفیدی میں کہیں کہیں دھبّے سے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ جھیل کے وہ حصے تھے جہاں اندر برف پگھل رہی تھی۔

جلدی کرو۔ میں بے تابی سے چلائی اور وہ موٹی بچی واقعی جلدی کرنے لگی۔ میرے آواز دینے پر نہیں بلکہ کسی اور کے بُلانے پر، لانبی جیٹی کے اس پار کوئی لڑکی ہاتھ ہلا کر اسے پکار رہی تھی۔

''جلدی کرو، موٹی۔'' برف پر دائرے بناتی ہوئی، ہلکی پھلکی، روشن شبیہ۔ مجھے خیال آیا یہ ضرور اس کی بہن ہوگی۔ اس کی بہن جو رقاصہ تھی، جو آندھی اور طوفان کی مغنیہ تھی۔ وہی بچی جو

مجھے پسند تھی اُس لمحے مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں اتنی دُور اسی نازک اور دلفریب ہستی کو دیکھنے آئی تھی۔ اس وقت اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ یہ دونوں بچیاں خطرے میں ہیں۔ کیونکہ اب جھیل کے اندر سے گہری آہوں اور کراہوں کی سی آوازیں آنے لگی تھیں، جو برف ٹوٹتے وقت پیدا ہوتی ہیں۔ یہ ہیبت ناک آوازیں، نالہ وفغاں بن کر اُبھر رہی تھیں۔ میں انھیں سُن رہی تھی۔ لیکن بچیاں نہیں سُن رہی تھیں۔

ہاں، یقیناً بچیاں یہ آوازیں نہیں سُن رہی تھیں۔ ورنہ وہ موٹی بچی اتنی خوفزدہ اور ڈرپوک بچی، یوں برف پر نہ چلی گئی ہوتی۔ اور بے ڈھنگے طور پر پھسلتی ہوئی دُور آگے ہی آگے نہ بڑھی چلی جاتی۔ اور اس کی بہن اسے دیکھ کر ہاتھ ہلاتی اور ہنستی ہوئی کسی بیلرینا کی مانند انگوٹھوں کے بل گھومتی، تھرکتی، برف پر تیرتی آٹھ کے خوب صورت نقش نہ بنا رہی ہوتی۔ اور وہ موٹی بچی کم از کم ان گہرے رنگ کے ٹکڑوں سے تو بچ کر چلتی جو برف پگھلنے کی وجہ سے جگہ جگہ جھیل پر پیدا ہو رہے تھے اور جنھیں دیکھ کر وہ بُری طرح گھبرا گئی تھی۔

مجھے یہ سب کچھ صاف دِکھائی دے رہا تھا۔ کیونکہ میں جیٹی پر بہت دُور تک قدم بہ قدم آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔ تختوں پر برف جمی ہوئی تھی اور پھسلن تھی۔ اس کے باوجود میں اس موٹی بچی سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اور وہ جھیل پر بالکل میرے نیچے تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو ہمیشہ کی طرح بے حِس اور کسی جذبہ سے عاری تھا۔ اس کے باوجود جانے کیوں یہ احساس ہوتا تھا کہ اس کے دل میں آرزوئیں بھری ہوئی ہیں۔ اب میں وہ شگاف بھی اچھی طرح دیکھ سکتی تھی جو جھیل کی سطح پر جگہ جگہ پیدا ہو رہے تھے اور جن کے اندر سے پانی کا جھاگ یوں نکل رہا تھا جیسے کسی دیوانے کے مُنھ سے کف جاری ہو۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ کس طرح موٹی بچی کے نیچے برف ٹوٹی اور وہ پانی کے اندر چلی گئی۔ یہ بالکل اسی جگہ ہوا جہاں ابھی کچھ دیر پہلے، جیٹی سے صرف چند قدم دُور، اس کی بہن بیلرینا کی طرح رقص کر رہی تھی۔

میں پہلے یہ واضح کر دوں کہ اس بچی کی، جو پگھلی ہوئی برف کے اندر چلی گئی تھی، جان کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ جھیل عموماً تہ بہ تہ منجمد ہوتی ہے اور تین فٹ نیچے برف کی دوسری منجمد اور سخت تہ

ضرور ہوگی۔ صرف یہ ہوا تھا کہ اب وہ بچی تین فٹ گہرے پانی کے اندر کھڑی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا اور اس بچی کے گرد برف کے بڑے بڑے تودے ٹوٹ رہے تھے۔ تاہم اگر وہ پانی میں تھوڑی دور، صرف چند قدم چل کر جیٹی تک پہنچ سکتی تو میں اس کا ہاتھ تھام کر اُسے اُوپر کھینچ لیتی۔ اس کے باوجود، میں نے سوچا اس سے اتنا بھی نہ ہو سکے گا۔ واقعی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ تھوڑا سا بھی آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ وہ وہیں کھڑی تھی اور خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہی تھی۔ برف اس کے ہاتھوں کے نیچے ٹوٹ رہی تھی۔ بوڑھا اکو یریس اسے اندر کھینچ رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ میرے دل میں اس کے لیے ذرا بھی رحم پیدا نہیں ہوا۔ میں بالکل بے حس، ساکن کھڑی رہی۔

اچانک اس موٹی بچی نے اپنا سر اُٹھایا۔ اس وقت چاند بادلوں کے پیچھے سے نکل آیا تھا اور چاند کی روشنی میں، میں نے دیکھا اس کا چہرہ بالکل تبدیل ہو گیا ہے۔ وہی نقش تھے، وہی چہرہ تھا، لیکن ایک اندرونی عزم اور حدت نے اسے تبدیل کر دیا تھا۔ اب اس کا چہرہ بے حد جاندار لگ رہا تھا۔ موت اس کے رُوبرو تھی اور اس لمحے جب موت اس سے اتنی قریب تھی، اس کے چہرے کے نقوش نے زندگی کا سارا رس پی لیا تھا۔ گویا دہکتی زندگی ان میں سمٹ آئی تھی۔ ہاں اب مجھے یقین تھا کہ موت اس کے بہت قریب ہے اور یہ انتہا تھی۔ میں جیٹی کے ریلینگز پر جھکی اس کے سفید چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی اور پانی کے اندر سے وہ چہرہ میری طرف یوں دیکھ رہا تھا، جسے وہ میرا اپنا عکس ہو۔

اب وہ موٹی بچی کسی طرح جیٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور ہاتھ بڑھا کر، کافی پھرتی سے اپنے آپ کو جیٹی کے اُوپر لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تختوں سے باہر نکلی ہوئی میخوں اور کانٹوں کو پکڑ پکڑ کر وہ اُوپر چڑھ رہی تھی۔ اس کی اُنگلیاں لہولہان ہو گئی تھیں اور اس کے جسم کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ اس کے لیے صرف میخوں کا سہارا کافی نہ تھا۔ وہ بار بار پھسل کر پانی میں گر جاتی تھی اور پھر نئے سرے سے اُوپر چڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ میں وہاں کھڑی اس طویل کربناک جدوجہد کو دیکھتی رہی۔ جان بچانے کے لیے یہ کشمکش بڑی شدید تھی۔ پیدائش و نمو کی وہ ا[illegible]ت جیسے

کوئی چیز اپنا خول توڑ کر باہر آنے کی جدوجہد کرے یا جیسے ریشم کا کیڑا اپنے کوئے سے باہر نکل کر زندگی ونمو پانے کی کوشش کرے۔اب وہ بچّی ایسی جگہ تھی جہاں میں آسانی سے اس کی مدد کرسکتی تھی۔اسے بچا سکتی تھی۔لیکن میں جانتی تھی کہ اب اسے میری مدد کی ضرورت نہیں رہی، کیونکہ اب میں نے اسے پہچان لیا تھا۔

مجھے یاد نہیں، میں اس رات کس طرح گھر واپس پہنچی۔صرف اتنا یاد ہے کہ زینے پر میں نے اپنی ہمسائی سے کہا تھا کہ اس جگہ اب بھی جھیل ہے، جنگل اور کھیت ہیں۔تو اس نے تعجب سے جواب دیا تھا۔نہیں، اب وہاں جھیل ہے نہ جنگل۔اور پھر میں نے دیکھا کہ میرے ڈیسک پر کاغذات اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں اور ان تتر بتر کاغذات کے درمیان ایک پُرانی تصویر نکل آئی جس میں ایک بچّی پُرانے فیشن کا اُونچے کالروں والا سفید اُونی کوٹ پہنے تھی۔اس کی آنکھیں جھیل کے پانی کی طرح شفاف تھیں اور وہ بہت موٹی تھی...... یہ میری اپنی تصویر تھی۔

سبز جیکٹ

(گرڈ گیسر)

ٹریسا نے وِنی سے کہا:

"وِنی یہ جیکٹ تمھارے جسم پر ٹھیک بیٹھتی ہے۔ ویسے ہے تو میرے سائز کی، پر فٹ تمھیں پر آتی ہے۔"

وِنی ٹریسا کی چھوٹی بہن ہے اور عمر کے لحاظ سے اس کی بیٹی نہیں تو بھتیجی یا بھانجی تو ضرور معلوم ہوتی ہے۔ بڑی بہن ٹریسا جو مختصراً ٹریسا بلکہ ریس کہلاتی ہے، ادھیڑ عمر کی ہو چلی ہے۔

ٹریسا نے اب وِنی سے یہ کہا۔ حالانکہ چند ہی ہفتے پہلے ڈیپارٹمنٹ سٹورز میں جب وہ یہی جیکٹ پہن کر دیکھ رہی تھی تو اس نے اپنے آپ سے کہا تھا "یہ جیکٹ ہے تو بہت اچھی، پر مجھ پر جچتی نہیں۔" پھر اُس نے وِنی سے بزرگانہ انداز میں کہا تھا:

"اور تم پر تو یہ بالکل ہی فٹ نہیں آتی وِنی، تم پہلے کچھ بنو تو۔ ابھی بچی ہو۔" اور یہ کہہ کر اس نے وِنی کے جسم پر سے جیکٹ اُتار لی تھی۔ سختی سے تو نہیں، لیکن کچھ ایسی نرمی سے بھی نہیں۔

مگر اس دوران میں پولیس کو، کچھ ہچکچاہٹ کے ساتھ، ٹریسا کے ساتھ معاملہ طے کرنا پڑا ہے۔ وہ طوعاً و کرہاً داخل ہوئی ہے۔ اور اس نے اس معاملے میں ٹریسا کے ساتھ خاصی رعایت کی ہے۔ پولیس زمانہ شناس ہے اور زمانہ شناس شہر دیومس کی پولیس پر ساری بات واضح ہے۔

"ہم بات آپس ہی میں طے کر لیں گے اور اس معاملے کو جلد ہی رازداری اور احتیاط سے نمٹا لیں گے۔" پولیس افسر ٹریسا سے کہتا ہے۔

ہرن کی نرم مخملیں کھال کی زیتونی سبز جیکٹ۔ ٹریسا قانون کے سامنے کھڑی ہے۔ نہیں، وہ ابھی قانون کے سامنے نہیں کھڑی ہے۔ پولیس کے سامنے کھڑی ہے اور اب پولیس نے اسے

بیٹھنے کی اجازت دے دی ہے۔ ثریا نے ایک چیز چرالی ہے۔ یہی ہرن کی کھال کی بنی ہوئی سبز قیمتی جیکٹ اور اب اسے یہ جیکٹ واپس کرنی پڑے گی۔ ریا اس کی عادی ہو چکی ہے۔ اگر چہ اب کی مرتبہ وہ اس لینے دینے سے باز رہ سکتی تھی۔ بہر صورت اُسے یہ چیز واپس دینی پڑے گی۔ خواہ پولیس کتنی ہی خوش مزاجی اور رورعایت سے کام لے۔

ڈیپارٹمنٹ سٹورز میں چوریاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ چوری کے بعد کھلے بندوں کسی کی رُسوائی ہو۔ لیکن اس سلسلہ میں کاروائی تو ضرور کی جاتی ہے۔ ایسی صورتوں میں چوری کرنے والے کی شخصیت کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ڈیپارٹمنٹ سٹورز سے چیزیں اُٹھا لے جانے والے عموماً ایسے لوگ ہوتے ہیں جن پر چوری کا سان گمان بھی نہیں ہوسکتا۔ ثریا کے سلسلے میں کوئی بڑا اسکینڈل ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ اتنی معروف نہیں تھی۔ پھر بھی اس کی پوزیشن کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک چھوٹا سا سکینڈل تو ضرور ہوسکتا تھا۔ ثریا ایک ایسے معروف ادارے میں ملازم تھی، جہاں تنخواہیں بہت اچھی دی جاتی تھیں اور جہاں صرف ایسے لوگوں کو ملازمت دی جاتی تھی جو قابلِ اعتماد ہوں۔ اس کے باوجود اُس نے کیف جان ڈیپارٹمنٹ سٹورز سے قیمتی ہرن کے سبز چمڑے کی یہ جیکٹ چرالی تھی۔ جیکٹ لیتے ہوئے اُسے کسی نے نہ دیکھا تھا اور وہ صاف بچ نکلتی اگر ایک دوسری لڑکی سے جو کار میں باہر اُس کا انتظار کر رہی تھی، غلطی سرزد نہ ہوتی۔ یہ دوسری لڑکی کچھ دیر اور ثریا کا انتظار کیے بغیر کار لے کر چل پڑی اور ثریا وہیں کھڑی رہ گئی اور پکڑی گئی۔ اس سے انکار کرتے بن نہ پڑی اور وہ پولیس کے حوالے کر دی گئی۔

اس فرم نے محض فیشن کے طور پر اپنے آپ کو ڈیپارٹمنٹ سٹورز کا نام دے رکھا ہے۔ دراصل یہ بڑی اعلیٰ اور نفیس دکان ہے جہاں صرف بہترین اور منتخب چیزیں ملتی ہیں۔ سارے بڑے افسر اور ملازم یہیں سے چیزیں خریدتے ہیں۔ فرم والے اس قسم کے نفسیاتی مجرموں سے خوب واقف ہیں۔ ایسے گاہک حاجت کی بنا پر چوری نہیں کرتے بلکہ وہ کسی نفسیاتی مجبوری کے تحت غیر ارادی طور پر کوئی چیز اُٹھا لیتے ہیں۔ لہٰذا ایسے کئی موقعوں پر فرم کی انتظامیہ نے مصلحت اندیشی اور رعایت سے کام لیا تھا لیکن ان کی اس درگزر نے غلط نتیجے برآمد کیے۔ چنانچہ اب

انتظامیہ نے گرفتار کرنے کا حکم دے رکھا تھا اور ٹریسا، گو افسوس کے ساتھ ہی، پولیس کے حوالے کر دی گئی تھی۔

ریسا پولیس کو اپنی ذاتی زندگی کی تفصیلات اور عمر وغیرہ بتا چکی ہے۔ اس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ اتحادی طاقتوں کے تجارتی مشن میں ملازم ہے اور یہ بھی بتا چکی ہے کہ اس کے پاس اتنا روپیہ ہے کہ وہ بہ آسانی یہ جیکٹ خرید سکتی ہے۔ پولیس کے ڈیوٹی افسر کی بھی ایسے گاہکوں پر خاص نظر ہے۔ وہ ان کے ساتھ شائستگی اور احترام کا لہجہ اختیار کرتا ہے اور معاملے کو خوش اسلوبی اور احتیاط سے طے کرنے کے لیے وہ اپنی شرائط پیش کرتا ہے۔

''ہم آپس میں ایک معاہدہ کریں گے۔'' وہ کہتا ہے۔ ''ہم اپنی جانب سے آپ کی طرف قدم بڑھانے کے لیے تیار ہیں۔ آپ اطمینان رکھیے باہر بات نہیں پھیلے گی اور ہم چپکے سے معاملہ کو رفع دفع کر دیں گے لیکن اس کے لیے دو ایک شرائط ہیں جو آپ کو پوری کرنی پڑیں گی۔ شرائط یہ ہیں:

چوری کی گئی چیز آپ کو خریدنی پڑے گی، اس کی عام قیمت فروخت پر (یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ افسر نے دراصل 'چوری' کا لفظ استعمال نہیں کیا) علاوہ بریں اتنی ہی رقم ڈیومس ریڈ کراس کے لیے دینی پڑے گی جس کی باقاعدہ رسید آپ کو ملے گی۔ اس کے بعد آپ کا کیس نہ پولیس کی فائیلوں میں جائے گا نہ اس سلسلے میں مزید کاروائی کی جائے گی۔

ہرن کی نرم کھال سے بنی ہوئی زیتونی سبز جیکٹ۔ یہ چیز پولیس کے دفتر کی میز پر رکھی ہے۔ یہاں یہ چیز بالکل اجنبی سی دکھائی دے رہی ہے۔ پولیس کی دم گھونٹ دینے والی فضا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ زیتونی سبز رنگ کے ہرن کے چمڑے سے بنی یہ جیکٹ جس کی مخمل پر انگلی سے چھونے سے بھی نشان پڑ جائے۔

افسر بڑے صبر سے کام لے رہا ہے۔ وہ اسے مجبور نہیں کر رہا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ ٹریسا کے لیے کوئی اور صورتِ انتخاب نہیں۔ ٹریسا کے فوری جواب نہ دینے پر وہ اپنا قلم اٹھا لیتا ہے اور

ایک فائیل کھول کر پڑھنے لگتا ہے، لہٰذا ثریا کو کچھ مہلت ملی ہے۔

وہ دُور دراز سرسبز سرزمین، ثریا کے خوابوں کی سرزمین، جہاں ہرن چوکڑیاں بھرتے تھے۔ ثریا نے بچپن سے اس کے خواب دیکھے تھے۔ لیکن اب وہ زمانہ گزر چکا ہے۔ اس وقت ثریا کے سینے میں ایک عزم اُبھر رہا ہے، ایک تاریک عزم، وہ اس شاطر پولیس افسر کے ساتھ معاملہ طے نہیں کرے گی اور اس بے سمجھی بوجھی حرکت سے اس کی بھری بزم میں رُسوائی ہوگی۔ وہ ایک عام، لچر نیچے درجے کے چور کی حیثیت سے ویومس کی عدالت کے سامنے پیش کی جائے گی۔ ایک لچر پبلک کے سامنے۔ اور اس کی ذاتی زندگی کی ساری تفصیلات منظرِ عام پر آئیں گی۔ اس کی عمر، اس کا پیشہ، وہ راز جواب تک سامنے نہیں آئے تھے، جو اس کے خوابوں میں سربستہ تھے اور وہ جو خوابوں سے باہر حقیقت بن چکے تھے۔ حتّٰی کہ اس کی زندگی کا وہ موڑ جب وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ وہ اپنی جوانی کھو چکی ہے اور بوڑھی کنواری بن چکی ہے۔

اس کی ماں نے اپنی آخری عمر میں ایک نئی زندگی کو جنم دیا تھا۔ پھر وہ بیمار رہنے لگی اور مر گئی اور اس نئی زندگی کو ثریا کے سپرد کر گئی۔ وہ بچی ثریا کے ذمہ تھی اور اس چھوٹی بہن کے علاوہ دو بھائیوں کی نگہبانی بھی اسی کے سر تھی، لہٰذا ثریا میٹرن بن چکی تھی۔

ایک دن وہ کیا سُنتی ہے کہ دوسرے کمرے میں اس کے دو بھائی ہوم ورک کرتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے ہیں:

''ریس'' ایک بھائی دوسرے سے کہہ رہا ہے، ''ریس'' پھر راشے[1] بن گئی ہے۔''

'راشے' کا لفظ شراب کشید کرنے والے ایسی شراب کے لیے استعمال کرتے ہیں جس میں شیرینی باقی نہیں رہی ہو، لیکن ابھی وہ ترشی اور تیزی بھی پیدا نہیں ہوئی ہو جس سے نشہ آجائے۔

''ریس، رئی رئی، ریم۔'' ایک بھائی گردان کرتا ہے۔

---

[1] جرمن زبان میں ریس، رس، اس، ان لفظوں کے ہیر پھیر سے مختلف معنی پیدا ہوتے ہیں۔ جنھیں ترجمہ میں منتقل کرنا مشکل ہے۔ اس کے معنی ہیں تلخ شراب کی مانند۔ انگریزی زبان میں راشے کا لفظ کسان استعمال کرتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں وقت سے پہلے پک جانا، پختہ ہو جانا۔

''سپیس، سپئ سپئ سپیم۔'' دوسرا بھائی ٹھوکا دیتا ہے۔

''رلیس، میں نے کہا۔'' پہلا پھر کہتا ہے۔ ''رلیس مونث ہے لیکن صرف گرامر کی حد تک۔ رلیس، رئی زئی ایم۔ ورنہ رلیس کا صنفِ لطیف سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ نیوٹر (بے جنس) ہے۔''

''نیوٹرل۔''

''صحیح لفظ نیوٹر ہے۔''

یہ سُن کر ریسا دم بخود کھڑی رہ جاتی ہے۔ غالباً وہ ان دو ناکارہ بھائیوں کو ناراض کر چکی ہے۔ شاید اس نے انھیں کسی بات پر ڈانٹا تھا۔ کیا اسے انھیں ڈانٹنے کا حق نہیں پہنچتا؟

یہ سُست، آوارہ، ناکارہ، نافہم لڑکے..... میز پر چمچے رکھتے ہوئے ریسا بغیر آنسوؤں کے چپکے چپکے رونے لگتی ہے۔ میں تمھارے لیے کھانا پکاتی ہوں۔ تمھاری غلاظت اُٹھاتی ہوں اور تم ہو کہ مجھے نیوٹر سمجھتے ہو، میرے وجود ہی سے انکار کرتے ہو اس میں میرا کیا قصور کہ میں بڑی بہن بنی۔

بہر حال یہ صبر آزما دن بھی گزر گئے۔ اب یہ بچے بڑے ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے، سوائے چھوٹی بہن کے۔

اب ریسا نے اچھی خاصی پوزیشن حاصل کر لی۔ وہ کام کرتی ہے۔ اپنا وقت ضائع نہیں کرتی۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچتی ہے۔ قابلِ اعتماد سمجھی جاتی ہے اور اپنی ملازمت میں تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی زندگی خوب گزر رہی ہے۔ اور وِنی اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی۔ وِنی اس پر بار نہیں ہے۔ وِنی پھول کی سی ہلکی پھلکی، خوش مزاج، صاف دل لڑکی۔ وہ ہر بات آسانی سے مان لیتی ہے۔ آسانی سے سیکھ لیتی ہے۔ ان دِنوں وِنی ٹریسا کے ساتھ رہ رہی ہے۔ وہ ایک فیشن سکول میں پڑھ رہی ہے اور وِیمس کی نفاست پسند سوسائٹی کے لیے ایک فیشن کورس کر رہی ہے۔ ریسا اس کی تعلیم کا خرچ برداشت کر رہی ہے۔ بلکہ وِنی کے اکاؤنٹ میں اس نے روپے جمع کیے ہیں اور اچانک ایک دن اس پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ لوگ اسے وِنی کی خالہ سمجھتے ہیں۔ خالہ ہونے میں کیا بُرائی ہے۔ ہاں خالہ۔ اس کے حلق میں کوئی چیز اٹکتی

محسوس ہوتی ہے۔

لیکن وِنی کے دم سے اس کے گھر میں رونق ہے۔ وہ سارے گھر میں گھومتی، چہکتی پھرتی ہے تو جی خوش رہتا ہے اور اس پر زیادہ خرچ بھی نہیں آتا۔ وِنی کو خوش رکھنا آسان بات ہے۔ چھوٹے چھوٹے تحفوں سے وہ خوش ہو جاتی ہے۔ اس کو ریسا ساتھ کار میں لیے پھرتی ہے اور کبھی اپنی کار اس کے حوالے بھی کر دیتی ہے۔ اس کے لیے دوستوں کو گھر بُلاتی ہے۔ اس سے پہلے اسے لوگوں کو گھر بُلانے کا خیال بھی نہ آتا تھا اور نہ کوئی اس سے ملنے آتا تھا اب لوگ بن بُلائے ہی چلے آتے ہیں۔

وِنی پوچھ رہی ہے، گھر پر کون آیا تھا؟ گُلدان میں کسی کے لائے ہوئے پھول رکھے ہیں اور کمرے کی ہیئت بتا رہی ہے کہ ابھی یہاں سے کوئی ہو کے گیا ہے۔ کوئی مہمان جس کی یہاں مہمان نوازی کی گئی ہے اور وہ پوچھتی ہے ''کون آیا تھا؟''

فالکنر ریسا رُکھائی سے جواب دیتی ہے۔ ''اور ہاں تمھیں گریٹنگز دے گیا ہے۔''

''فالکنر؟'' وِنی کہتی ہے۔ ''بے چارہ۔ یہاں آیا اور میں اُسی وقت باہر گئی ہوئی تھی۔''

جواب میں ریسا کچھ نہیں کہتی۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی ہے لیکن اس کی مُٹھی بھنچ گئی ہے۔ اور بھنچی ہوئی مُٹھی میں سگریٹ کی ڈبیا پچک کر ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ سکرٹ اور بلاوز پہنے کمر میں بیلٹ کس کر باندھے ریسا بیٹھی ہے اور وِنی اس کی طرف توجہ بھی نہیں دیتی۔ وہ کمرے میں گھوم رہی ہے، آدھی آستینوں والا مختصر کوٹ پہنے، بغیر بیلٹ لگائے۔ اچانک ریسا اس سے تُند تیکھے لہجے میں کہتی ہے۔

''کیا تمھیں اس کا یقین ہے کہ فالکنر تمھارے لیے آیا تھا؟''

تتلی کی طرح پھڑکتی وِنی رُک جاتی ہے اور گُم سُم کھڑی رہ جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی بہن کی آواز کو پہچان نہیں پاتی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور ریسا سوچتی ہے، وِنی پر یہ بات واضح ہے۔ اس میں کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ سوچ کر وہ پھر کہتی ہے، حالانکہ وہ یہ بات کہنا نہیں چاہتی۔

''یہ کوئی یقینی بات نہیں کہ وہ تمھارے لیے آیا تھا۔''

اور اب اس کی آواز اس کا ساتھ نہیں دیتی۔ وہ اچانک اُٹھ کر کمرے سے باہر چلی جاتی ہے۔ مُٹھی میں سگریٹ کا پیکٹ بھینچے ہوئے۔ یہ پیکٹ، وہ تلخی سے کہتی ہے۔ اسے اپنے آپ پر بُری طرح غصہ آرہا تھا۔ یقین، کیسا یقین؟ کیا میں ختم ہوچکی ہوں؟ نیوٹر ہوں؟ اور وہ بچّی، بالشت بھر کی چھوکری، میری بہن، اس کو یقین ہے۔ وہ جلی بھُنی اندر جا کر دروازہ بھیڑ لیتی ہے اور تالا لگا لیتی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد ذرا تازہ دم ہو کر باہر نکلتی ہے۔ تازہ میک اپ کیے اور اپنے آپ سے کہتی ہے۔ ''میں بھی کتنی مضحکہ خیز ہوں!'' پھر وہ نیچے اُتر کر کار میں جا بیٹھتی ہے اور کار کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے غرور سے سر پیچھے جھٹک کر کہتی ہے۔

''مضحکہ خیز کیوں؟ میں مضحکہ خیز نہیں ہوں۔''

اس کے بعد ان دونوں بہنوں میں اس چھوٹے سے واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ ان کی زندگی کے معمول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ریسا ہر روز کار میں دفتر جاتی ہے اور اپنی بہن کو راستے میں اس کے اسکول چھوڑ دیتی ہے۔ وِنی کچھ دیر ذرا کھچی کھچی رہتی ہے۔ حساس چڑیا اور اسی وجہ سے ریسا اس کے ساتھ ذرا مشفقانہ سلوک اختیار کرتی ہے بہرحال دونوں بہنوں میں ذرا سی کشیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ ذرا سا فاصلہ اور یہ فاصلہ مناسب بھی ہے۔ مناسب کیوں؟ اس ننھی سی چڑیا کے ساتھ بھلا کون بیر رکھ سکتا ہے؟

''تین سو ساٹھ ریگن۔'' پولیس افسر خوش معاملگی کے لہجے میں کہتا ہے۔ ''یہ لیجیے۔ یہ اسی بل کی رسید ہے جو ڈیپارٹمنٹ سٹورز کو جائے گی۔ اور یہ دوسری ریڈ کراس کی رسید ہے۔ کُل رقم سات سو بیس ریگن بنتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی مزید اخراجات نہیں ہیں۔ اور یوں معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہوسکتا ہے۔''

''تین سو ساٹھ ریگن۔'' کیف جان ڈیپارٹمنٹ سٹورز کی سیلز گرل دونوں بہنوں سے کہتی ہے۔ اب ان دونوں بہنوں میں کشیدگی نہیں رہی اور حسبِ معمول ریسا کا سلوک اپنی بہن کے ساتھ فیاضانہ ہے۔ حسبِ معمول وہ سیر کے لیے نکلی ہے اور وِنی کو اپنے ساتھ لے گئی ہے اور دونوں بہنیں دکانوں میں ادھر اُدھر دیکھتی پھر رہی ہیں اور یہ جیکٹ جس پر ان کا جی آیا ہے، ایک

نادرروزگار چیز ہے۔

''مادام، آپ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھیے اور پہلے ہی نہ، نہ کہیے۔'' سیلز گرل کہتی ہے اور ٹریسا اپنی مرضی کے خلاف جیکٹ پہن کر آئینے میں دیکھتی ہے۔ یہ مخملیں، سبز جیکٹ، نہیں یہ تمھارے لیے نہیں ہے، وہ اپنے آپ سے کہتی ہے پھر وہ سیلز گرل سے کہتی ہے:

''یہ جیکٹ ہے تو بہت اچھی۔ پر مجھ پر نہیں سجتی۔''

''یہ آپ پر بالکل فٹ آئی ہے مادام، آپ پر خوب سجتی ہے۔''

''ہوسکتا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے کہا یہ میرے لیے نہیں ہے۔ بہر حال ہم لوگ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ مجھے جیکٹ کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ضرورت سے تمھارا کیا مطلب ہے، ریسا؟'' وِنی کہہ اُٹھتی ہے۔ ''ضرورت کی بھی تم نے ایک ہی کہی۔ ذرا اس جیکٹ کو تو دیکھو کتنی بڑھیا چیز ہے۔ اور تم یہ جیکٹ خرید بھی سکتی ہو۔''

''میرے خرید سکنے یا نہ سکنے کا سوال نہیں۔'' ٹریسا، جس کے ذمہ یہ خرچ پڑے گا، کہتی ہے۔ اس پر فوراً سیلز گرل چالاکی سے پہلو بدل کر کہتی ہے۔

''غالباً وہ دوسری خاتون اسے پہن کر دیکھنا پسند کریں گی۔''

اور پھر اس کی مرضی کے برخلاف وِنی کو یہ جیکٹ پہنائی جا رہی ہے۔ ریسا اس دوران میں کوئی اور چیز اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی ہے۔ پھر وہ واپس آ کر وِنی کا عکس آئینے میں دیکھتی ہے۔ ساتھ ہی اپنا عکس دیکھتی ہے اور جیکٹ وِنی کے جسم سے اُتارتے ہوئے زیادہ سختی سے تو نہیں، لیکن کچھ ایسی نرمی سے بھی نہیں۔ کہتی ہے:

''اب اس بے معنی کھیل کو ختم کرو۔ میں جو کہہ رہی ہوں، وہ ٹھیک ہے۔ یہ جیکٹ مجھ پر نہیں سجتی۔ اور یہ تمھارے جسم پر تو بالکل ہی فٹ نہیں آتی۔ تم پہلے کچھ بنو تو۔ ابھی بچی ہو۔''

ٹریسا وِنی کو بڑے مشفقانہ، مربیانہ لہجے میں مخاطب کرتی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی آواز میں محبت نہیں ہے، لیکن اس کی آواز میں، زیریں لہجہ میں وہ کیفیت بھی آملی ہے جو اس موڈ کی غماز ہے جس کے تحت اس نے غیر ارادی طور پر کہا تھا:

"تمھیں اس کا یقین ہے کہ وہ تمھارے لیے آیا تھا؟"

لہٰذا یہ جیکٹ خریدی نہیں گئی۔ پارکنگ کی جگہ پہنچ کر ریسا اب اپنی نارمل آواز میں کہتی ہے، جس میں کسی زیریں لہجہ کا شائبہ بھی نہیں۔ "اب کار تم چلاؤ وِنی۔ ہم دریا کے اس پار کسی اچھی جگہ پر کھانا کھائیں گے۔ ہاں، سماپنٹ پر کھانا کھائیں گے۔" وہ ابھی ماگورہ پُل پر پہنچے ہیں کہ ریسا کو یاد آتا ہے۔ وہ اپنا ہلکا کوٹ گیف جان ڈیپارٹمنٹ سٹورز پر بھول آئی ہے۔ "کوئی بات نہیں۔ میں کل آکر لے لوں گی۔" وہ وِنی سے کہتی ہے۔ لیکن وِنی اس کی توجہ اس بات پر مبذول کراتی ہے کہ سماپنٹ پر رات کے وقت خاصی سردی پڑے گی اور وہ باہر بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ وہ کار واپس موڑتے ہوئے ریسا سے کہتی ہے:

"ڈیپارٹمنٹ سٹورز کے بند ہونے میں ابھی کافی وقت ہے۔"

اگر گیف جان ڈیپارٹمنٹ سٹورز بند ہو چکا ہوتا تو سب کچھ نہ ہو پاتا۔ لیکن ڈیپارٹمنٹ سٹورز کھلا ہے۔ سٹورز کے اس دوسرے دروازے پر جہاں سے بہت کم لوگ آتے جاتے ہیں وِنی کار روک لیتی ہے اور ریسا اس سے کہتی ہے۔ "اچھا تو تم کار ہی میں بیٹھی رہو۔ میں ابھی، ایک لمحے میں واپس آئی۔"

ریسا چونکہ جلدی میں ہے اس لیے وہ بجائے لفٹ تک جانے کے، جو پرلی طرف ہے، اس زینے پر چڑھنے لگتی ہے جو بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ وہ چپکے سے اُوپر پہنچتی ہے۔ فرش پر اس کے قدموں کی آواز بھی نہیں ہوتی۔ وہ ہر طرف مُڑ کر دیکھتی ہے لیکن کسی کو وہاں نہیں پاتی۔ وہاں کوئی نہیں جسے وہ اپنی واپسی کی وجہ سمجھا سکے۔ وہ آبگینوں اور شوکیسوں کے درمیان جلدی سے گزرتی ہوئی اس جگہ پہنچتی ہے اور ایک سرسری نظر سے جائزہ لیتی ہے۔ اس کا کوٹ وہیں کرسی کی پُشت پر لٹکا ہوا ہے اور وہ سبز، مخملیں جیکٹ بھی کاؤنٹر پر رکھی ہے۔ شاید سیلز گرل اسے واپس اپنی جگہ رکھنا بھول گئی ہے۔ ریسا یہاں رُک کر اپنا کوٹ اُٹھا کر کندھوں پر یونہی ڈال لیتی ہے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ جیسے یہ منزل چھوڑ کر سب کہیں چلے گئے ہوں۔ کوئی آواز نہیں، کسی کے قدموں کی آہٹ نہیں اور ریسا مُڑ کر دیکھے بغیر، بے جھجک اپنا کوٹ اُتار کر یہ سبز جیکٹ پہن لیتی ہے۔ جو اُس

کے بدن پر نرم اور ٹھنڈی محسوس ہوتی ہے اور پھر اس کے اُوپر اپنا کوٹ پہن کر گردن پر کالر اُونچا کر لیتی ہے۔ یہ سب کچھ جلدی ہی ہو جاتا ہے۔ بس لمحوں میں۔ پھر اُس کے پاؤں خود بخود حرکت کرنے لگتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ بغیر کسی آہٹ کے چل رہی ہے۔ پھر لکڑی کے پار کے فلور پر اس کے قدموں کی کھٹ کھٹ سُنائی دیتی ہے۔ اب وہ لفٹ کے سامنے ہے۔ لفٹ کا دروازہ کھلتا ہے اور لفٹ آپریٹر جھک کر اسے سلام کرتا ہے اور ایک طرف ہٹ کر اسے جگہ دیتا ہے۔ اس آدمی کا ایک ہاتھ غائب ہے۔ وہ یونیفارم پہنے ہوئے ہے اور بغیر ہاتھ کی خالی آستین کو کوٹ کی جیب میں چھپائے ہوئے ہے۔ دوسرے سالم ہاتھ سے وہ لفٹ چلاتا ہے۔ لفٹ کا دروازہ بند ہوتا ہے اور ٹریسا اس آدمی کے اس سوال پر اثبات میں سر ہلاتی ہے۔ ''سب سے نچلی منزل مادام؟'' لفٹ نیچے اُترتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور اب ریسا کھلی فضا میں کھڑی ہے۔ تازہ ہوا میں سانس لیتی ہوئی وہ اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتی ہے۔ اور اب اسے اچانک احساس ہوتا ہے۔ اس نے کیا کیا ہے۔ یہ کیا دیوانگی ہے؟ وہ اپنے آپ سے کہتی ہے اور تصوّر میں اپنے آپ کو دیکھتی ہے کہ ماگورہ پُل یا سماپٹ جاتی ہوئی سڑک پر اس نے اپنا پُرانا کوٹ کھول لیا ہے۔ اور بڑی دل جمعی کے ساتھ، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وِنی سے کہہ رہی ہے۔ ''تمھیں تعجب ہو رہا ہے؟ آخر میں نے اپنا ارادہ بدل ہی لیا اور جیکٹ خرید لی۔''

اور اس دوران میں پولیس افسر نے رسیدیں تیار کر لی ہیں۔ وہ انھیں لفافہ میں بند کر کے ٹریسا کے حوالے کرتا ہے۔ ٹریسا یہ لفافہ اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ کر اُسے بند کرتی ہے اور اب اسے یہاں سے بھاگ نکلنے کی جلدی ہے۔ وہ تھک گئی ہے، اس کا سر چکرا رہا ہے اور وہ یہاں سے جلد نکلنا چاہتی ہے۔ پولیس افسر پیچھے سے آواز دیتا ہے:

''معاف کیجیے مادام، آپ ایک چیز یہاں چھوڑے جا رہی ہیں۔ آپ اپنا جیکٹ بھول رہی ہیں، یہ اب آپ کی ملکیت ہے۔''

''آپ اس جیکٹ کا جو چاہے کیجیے۔ میں اسے نہیں لے جاؤں گی۔ اس سے میرا جی بھر چکا ہے۔ آپ اسے لے جانے پر مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔''

''میں آپ کو مجبور کرنے سے قاصر ہوں مادام، لیکن آپ یہ جیکٹ نہیں لے جائیں گی تو پھر یہ آپ کے پاس سرکاری ذریعہ سے ہی پہنچے گی، پوسٹ کے ذریعہ......''

اب ریسا آپے سے باہر ہو جاتی ہے اور بے قابو ہو کر کہتی ہے:

''آپ جو چاہے کیجیے۔ گھر میں میرے پاس قینچی تو ہے، جو یہاں نہیں ہے تا کہ میں اس چیز کو کُتر کُتر کر اس کے چیتھڑے بنا ڈالوں۔ اس سے مجھے بڑی خوشی ہو گی۔''

''بڑے افسوس کی بات ہے مادام، اگر آپ اتنی قیمتی چیز کے ساتھ یہ سلوک کریں گی۔''

''میں یہ جیکٹ آپ کو تحفے میں دیتی ہوں۔ آپ اس کا جو چاہیں کیجیے۔ جسے چاہیں دے دیجیے۔''

''یہ بات ہمارے اُصولوں کے خلاف ہے۔ بہر حال اگر آپ مُصر ہیں کہ یہ جیکٹ تحفے میں دیں تو ایک صورت ہو سکتی ہے۔ آپ اسے ریڈ کراس کے لیے چندے میں دے دیجیے۔ اس چندہ کی رسید بھی آپ کو دی جائے گی۔ اور رسیدیں تبدیل کرنی پڑیں گی۔''

''اچھا رسیدیں تبدیل کیجیے، مگر جلدی سے......''

ریسا کہتی ہے، جلدی کیجیے، مگر ایسے کام جلدی سے نہیں نمٹتے کیونکہ کمرے میں کوئی نہ کوئی آجاتا ہے، کسی ضروری کام سے اور پھر ٹیلیفون کی گھنٹی پر گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ اس کے بعد افسر ریسا سے مخاطب ہوتا ہے:

''کیا آپ نے اپنی کار ایک نوجوان لڑکی کے پاس چھوڑ دی تھی، جو آپ کی رشتہ دار ہے؟''

''اوہ، میرے خدا۔'' ریسا کہتی ہے۔ ''میں نے اس بارے میں سوچا تک نہ تھا۔ کیوں کار کو کیا ہوا؟''

''گھبرائیے نہیں، سب خیریت ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ آپ اپنے کاغذات اپنی رشتہ دار کو دینا بھول گئی تھیں۔ ماگورو پُل پر گشتی پولیس نے کار کو روکا۔ کار ڈرائیو کرنے والی کے پاس ضروری کاغذات نہیں تھے۔ آپ کی تلاشی کی گئی۔ آپ گھر پر نہیں تھیں۔ اس وقت کاغذات

ضرور آپ کے پاس ہوں گے؟''

''ہاں، یقیناً۔''

''تو پھر ضمانت دے کر اپنی رشتہ دار کو چھڑا لیجیے۔'' افسر کہتا ہے اور پھر گویا آخری بار اسے اطمینان دلاتا ہے۔ ''اطمینان رکھیے۔ آپ کی اس رشتہ دار کو بالکل خبر نہ ہوگی کہ آپ کو یہاں پولیس کے دفتر میں روکا گیا تھا۔''

اگر ٹریسا اپنی کار اسی جگہ کھڑی پاتی جہاں اسے ہونا چاہیے تھا، یعنی ڈیپارٹمنٹ سٹورز کے سامنے، جہاں کار سے اُتر کر اُس نے وِنی سے کہا تھا۔ ''میں ابھی، ایک لمحے میں، واپس آئی۔'' تو بھی یہ واقعہ اس کی بدحواسی کے لیے کافی تھا۔ بھلا ایسی عورت کے حواس کیسے قائم رہ سکتے ہیں جو ابھی ابھی چوری کر کے آئی ہو، چوری کی جیکٹ جس کے جسم پر ہو اور وہ اسے کوٹ کے اندر چھپائے ہوئے بس یہ تمنا رکھتی ہو کہ کہیں جلدی سے چھپ جائے۔ اور ایسے میں جیسے کہ خوابوں میں بے تکی باتیں اور بے سروپا واقعات ہوتے رہتے ہیں، وہ یہ دیکھتی ہے کہ کوئی شخص سڑک کے اُس پار کھڑا ہے۔ جیسے وہ کسی سواری کی تلاش میں ہو یا جیسے وہ پیچھے کسی کا انتظار کر رہا ہو یا کسی کار کا جو ابھی سڑک پر نکلی ہے اور وہ اچانک مُڑ کر دیکھتا ہے۔ یہ فیولنر ہے۔ وہی فیولنر، جس کے بارے میں وِنی نے کہا تھا۔ ''بے چارہ فاکنر یہاں آیا تھا اور میں اسی وقت باہر گئی ہوئی تھی۔

فاکنر مُڑتا ہے اور ٹریسا پر اس کی نظر پڑتی ہے جو سبز جیکٹ کوٹ کے نیچے پہنے ہوئے ہے۔ وہ اُسے دیکھ کر ہاتھ ہلاتا ہے۔ اب ٹریسا کے لیے کوئی مفر نہیں ہے۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹتی ہے۔ پھر ڈیپارٹمنٹ سٹورز کے دروازے کے اندر چلی جاتی ہے اور چند سیڑھیاں چڑھ کر دم سادھے کھڑی رہتی ہے۔ اس کی سانس اُکھڑی ہوئی ہے اور دماغ پراگندہ ہے۔ وہ بالکل ایسی جگہ کھڑی ہے جہاں اسے آسانی سے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔

''تمھیں اس کا یقین ہے کہ وہ تمھارے لیے آیا تھا؟'' یہ کہہ کر ریسا نے وِنی کو چیلنج نہ کیا ہوتا تو وِنی اسی جگہ کار میں بیٹھی رہتی۔ وہ فیولنر کی اتنی پروا نہ کرتی۔ بلکہ وہ وہیں کار میں بیٹھی اس کا انتظار کرتی۔ فیولنر، جو اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا، خود ہی سڑک پار کر کے اس کے پاس آتا اور پھر وہ

اطمینان سے بیٹھی فائلز سے خوش گپیاں کرتی ہوئی اپنی بہن کا انتظار کرتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ وِنی بے چین ہو جاتی ہے۔ وہ تو جوان ہے۔ بہت جلد اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ اور اس موقع پر ٹریفک روشنیاں سبز ہو جاتی ہیں اور کاروں کی ایک لمبی قطار اس کے اور فیولز کے درمیان، جو سڑک کے اس پار کھڑا ہے، حائل ہو جاتی ہے۔ کاروں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اس کے سامنے سے گزرتا ہے اور جیسے ہی ٹریفک روشنی زرد ہو جاتی ہے وہ اپنی کار نکال کر دوسری کاروں کے پیچھے لگا دیتی ہے اور اس کی کار دوسری کاروں کے درمیان پھنسی ہوئی ہے اور کاروں کے ریلے کے ساتھ ہی چلی جا رہی ہے۔ آگے ہی آگے۔ اور وہ بے بس سی ہو جاتی ہے۔ کار کو واپس موڑ بھی نہیں سکتی۔ بے مقصد آگے ہی آگے بڑھی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ ماگورہ پُل پر پولیس اسے روک لیتی ہے، چونکہ کاغذات اس کے پاس نہیں ہیں۔

پولیس نے درگزر اور نرمی سے کام لیا ہے۔ وِنی کو محض خبردار کر کے چھوڑ دیا گیا ہے اور ریسا سے ریڈ کراس کے لیے چندہ لے کر ٹریسا کو بھی چھوڑ دیا گیا ہے۔ بڑی آسانی سے معاملہ طے ہو گیا ہے۔ پولیس کی فائیلوں میں کوئی بات درج نہیں کی گئی۔ ریسا کے لیے کوئی ڈر کی بات نہیں اور نہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی موجودہ ملازمت چھوڑ دے۔ لہٰذا اس کے دفتر میں سب حیران رہ جاتے ہیں جب وہ اپنا استعفا پیش کرتی ہے۔ اور ایک دوسری جگہ کے لیے اپنی خدمات پیش کرتی ہے جو ابھی خالی ہوئی ہے۔

"مجھے آب و ہوا کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔" ٹریسا کہتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہو گی، لوگ اس کی بات مان لیتے ہیں۔ اتنی قابلِ اعتماد اور اچھا کام کرنے والی لڑکی کو دفتر والے الگ نہیں کرنا چاہتے لیکن جس جگہ اب وہ جا رہی ہے، یہاں سے بہت دُور، وہاں بھی قابلِ اعتماد کام کرنے والوں کی ضرورت ہے اور ریسا بڑی آسانی سے اپنا تبادلہ کرا لیتی ہے۔ ریسا یہ چاہتی ہے کہ جب تک سب کچھ طے نہ ہو جائے اس کے استعفے کو راز رکھا جائے۔

دُور، بہت دُور، غزالوں کی سرزمین میں، ریسا سوچتی ہے۔ وہ اب بہت دُور جانے والی ہے۔ اس کا سارا سامان پیک ہو چکا ہے اور اس کے جان پہچان والوں کو اب خبر ہوتی ہے کہ ریسا

جارہی ہے۔

ریسا کے مشن میں پارٹی دی گئی ہے اور وہ اپنے دوستوں کے درمیان ایک میز پر بیٹھی ہے۔ جیسے جیسے شام ڈھلتی جارہی ہے پارٹی کی رونق بڑھتی جارہی ہے۔ حسب معمول تمبولا کا پروگرام ہے اور انعامات کے مظاہرے سے پہلے وہ ٹکٹیں جو بچ رہی تھیں، نیلام کی جارہی ہیں اور زیادہ سے زیادہ پیسے دینے والوں کو مل رہی ہیں۔ یوں ریڈ کراس کے لیے بہت سارو پیہ جمع ہورہا ہے۔ اب وہ کھیل ختم ہونے پر جیتنے والوں کے ٹکٹ نمبر پکارے جارہے ہیں۔ انعامات خاصے قیمتی ہیں۔ ان کے علاوہ مذاق کے طور پر ایسے انعامات بھی رکھے گئے ہیں جن کے ملنے پر حاضرین خوب ہنستے اور شور مچاتے ہیں۔

اور آخرکار پہلا انعام سامنے لایا جاتا ہے۔ ہرن کی کھال کی بنی ہوئی، زیتونی سبز رنگ کی مخملیں جیکٹ۔ یہ انعام دیکھ کر حاضرین کے مُنھ سے مارے خوشی اور حیرت سے چیخیں نکل جاتی ہیں اور اب اس انعام کے جیتنے والے کا اعلان کیا جارہا ہے اور ٹکٹ نمبر دو تین مرتبہ پکارا جاتا ہے۔

''ہائے یہ وہی جیکٹ ہے۔'' وِنی چلاّ اُٹھتی ہے۔ ''دیکھو ریسا بالکل وہی......'' لیکن ریسا وہاں سے اُٹھ گئی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ کا کوئی پُرزہ مروڑ کر پھینک دیتی ہے اور حاضرین کی قطاروں کے درمیان چلتی ہوئی ہال سے باہر نکل جاتی ہے۔

''تم کوئی توجہ نہیں دے رہی ہو۔'' وِنی کے بازو میں بیٹھا ہوا فالکنر کہتا ہے۔ اس نے زمین پر پڑا ہوا مڑا تڑا کاغذ اُٹھالیا ہے۔ وہ اس کی شکنیں صاف کرتا ہے۔ پھر وِنی سے کہتا ہے:

''جلدی سے اپنے نمبر کا اعلان کرو۔ دیکھتی نہیں ہو، یہ جیتنے والا نمبر تمھارا ہے۔''

''یہ تو ریسا کا ٹکٹ ہے۔'' وِنی فالکنر کے ہاتھ سے ٹکٹ چھین لیتی ہے۔

لیکن اس دوران میں ریسا واپس آ گئی ہے۔ وہ سٹیج پر چڑھ کر انعام قبول کرتی ہے اور قیمتی مخملیں جیکٹ اپنے بازو پر ڈال کر نعروں اور تالیوں کے درمیان سٹیج سے اُترتی ہے۔

''ہاں یہ سچ ہے کہ یہ میرا نمبر ہے اور اس جیکٹ کا سائز بھی میرا سائز ہے، لیکن میں اپنے کپڑے پیک کر چکی ہوں۔'' ریسا کہتی ہے۔ ''اسے تم پہن لو وِنی، یہ جیکٹ تمھارے جسم پر فٹ

آ ئے گی۔ پہن لو نا، آخر تم پہلے اسے پہن کر دیکھ ہی چکی ہو۔"

"پہلے پہن کر دیکھ چکی ہو؟ کیا مطلب؟" میز کے گرد بیٹھے ہوئے دوست حیرت سے پوچھتے ہیں۔

اور ریسا بے پروائی سے یہ کہہ کر سگریٹ جلاتی ہے:

"جانے دیجیے، سارا معاملہ ہی عجیب مہمل سا ہے لیکن اب یہ راز ہی رہے گا۔"

پھوٹ

(وولف ڈیٹرش شنُورے)

اگست ۱۹۵۹ء

وہ والٹر کے انتظار میں دریچے کے پاس کھڑی تھی۔ شام ہو چلی تھی، اندھیرا پھیل رہا تھا اور مارکس انگلس سکوئر سے سیمنٹ کی دھول اور ڈیزل آئیل کی بُو آ رہی تھی۔ برگ سٹریٹ کی اِکا دُکا روشنیاں نیچے سپری ندی کے پانی میں جھلملا رہی تھیں اور ساری فضا پر دُھند سی چھائی ہوئی تھی۔

یہ بہتر تھا کہ وہ والٹر کو ایک تحریری بیان میں سب کچھ بتا دیتی۔ بلکہ ایک چھوٹا سا نوٹ اس کے لیے میز پر چھوڑ جانا ہی کافی تھا۔ یہ نہیں کہ وہ سمجھتا نہیں تھا۔ وہ اسے بہت اچھی طرح سمجھتا تھا لیکن اس وقت صرف اس کا فہم کافی نہیں تھا۔ سوال یہ نہیں تھا کہ وہ ذہن میں کیا سوچتا ہے، بلکہ یہ کہ وہ اپنے دل میں کیا محسوس کرتا ہے اور والٹر کا دل انھیں باتوں کی طرف کھنچا ہوا تھا جن سے وہ دُور جانا چاہتی تھی۔ لہٰذا وہ اس سے کیا اُمید رکھ سکتی تھی؟

وہ بیس سال ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزار چکے تھے۔ ہاں، یہی بات تھی۔ بیس سال کے طویل عرصہ کا ساتھ۔ یہ رفاقت بھی کیا رفاقت تھی کہ صبح سے شام تک وہ مطبع میں کام کرتا تھا۔ پھر شام کو مچھلیاں پکڑنے کو پفر گرابن چلا جاتا تھا۔ اور وہ خود ایچ، او کے تجارتی ادارے میں پورے دس گھنٹے کام کرتی تھی۔ پھر بھی انھیں ایک دوسرے کا سہارا تھا۔ راتوں کو وہ ایک دوسرے کی سانسیں سُنتے تھے اور چھٹی کے دن اتوار کو ساتھ باہر جایا کرتے تھے۔ کبھی پلنٹر والڈ کی طرف، کبھی جھیل مُئیگل کی طرف۔ اور انھیں باتوں نے ان میں فطری یگانگت پیدا کر دی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں جنگ کے زمانے میں، ایک سپاہی کے ساتھ جو کچھ ہو گیا تھا، اس کے نتیجہ میں اگر والٹر نے اس کا

حمل نہ گروادیا ہوتا جس سے نہ وہ اجنبی سپاہی کے بچے کی ماں بن سکی نہ ان کا اپنا کوئی بچہ پیدا کرسکی۔ تو ان کے بچے ہوتے اور بچوں کی وجہ سے ان کا تعلق زیادہ گہرا اور مضبوط ہو جاتا۔

دور، اس کی دائیں طرف، ایس ٹریم، ایک دمکتے کیڑے کی طرح دریا کے کنارے کنارے گزر گئی۔ وہاں جانوسکوئر تھا۔ پھر الگز ینڈر اسکوئر (چوک) پھر اس کے آگے مارکس انگلس وِنسٹ پَل اور اس سے بھی آگے فریڈرش سٹریٹ۔ جب کبھی ہوا کا رُخ ٹھیک ہوتا، انسپکٹر کی آواز مائیکروفون پر صاف سُنائی دیتی۔ یہ ڈیموکریٹک سیکٹر کا آخری اسٹیشن ہے۔ وہ اکثر اس آواز کو خواب میں بھی سُنا کرتی تھی۔ اور ہمیشہ اس آواز کا تصور کیا کرتی تھی۔ اور اب وہ اس آواز کو آخری بار، ایک مرتبہ اور سُنے گی، اور بہت قریب سے سُنے گی۔ اور پھر وہ اس آواز کو اپنی حقیقی زندگی میں کبھی نہ سُن سکے گی۔ کبھی نہیں۔

وہ چاہتی تھی کہ اپنے نئے فیصلہ پر کم از کم کچھ صدمہ تو محسوس کرے، یا اس کے رونگٹے ہی کھڑے ہو جائیں۔ لیکن اس کی تو نبض بھی تیز نہ ہوئی۔ جب اس نے اپنے آخری اور قطعی فیصلہ کے بارے میں سوچا کتنی عجیب بات تھی، اس نے سوچا، میں اپنی زندگی کے چالیس سال یہاں گزار چکی ہوں۔ لیکن اس وقت وہ اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے بارے میں سوچنا نہ چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے اپنے آپ سے کہا:

''بچپن سے میری زندگی یہیں گزری ہے۔''

اب وہ یہاں کی زندگی سے بے انتہا اُکتا گئی تھی۔ حتیٰ کہ مغربی برلن جا کر ایک نئی زندگی شروع کرنے کے احساس تک سے اسے کوئی خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اپنے تخیل میں یہ ساری باتیں اتنی مرتبہ دُہرا چکی تھی کہ اب کوئی ہیجانی کیفیت باقی نہ رہی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ والٹر اندر داخل ہو رہا تھا۔

''شام بخیر ایلسے۔''

''شام بخیر والٹر۔''

اور اب اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ والٹر نے غالباً زینے پر چڑھتے ہوئے

روشنی نہیں جلائی تھی۔ ورنہ اس کی آنکھیں اتنی جلدی کمرے کی تاریکی کی عادی نہ ہو جاتیں اور وہ اندھیرے میں صوفے پر رکھا ہوا سوٹ کیس نہ دیکھ لیتا۔

''تم جا رہی ہو؟'' وہ دریچے کے پاس اس کے پاس آ کھڑا ہوا اور اس نے اپنے نتھنوں میں مطبع کی روشنائی کی بُو محسوس کی۔ وہ مانوس بُو جو والٹر کے ساتھ وابستہ تھی۔ اسے اب بھی یہ بُو اچھی لگتی تھی۔

''میں تمھارا انتظار کر رہی تھی کہ جانے سے پہلے خدا حافظ کہہ لوں۔''

اس نے کچھ نہ کہا اور ہاتھ باندھے نیچے دیکھتا رہا۔ نیچے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرف۔ اس کی آنکھوں میں وہ کیفیت تھی جو مچھلی کا شکار کرتے وقت ہوا کرتی تھی۔ والٹر میں بس یہی ایک چیز تھی جس سے وہ نفرت کرتی تھی۔

''کچھ کہتے کیوں نہیں؟''

ایک لمحے کے لیے والٹر نے اپنی سانس روک لی۔ لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔ اس کے حلق میں کوئی چیز اٹکتی محسوس ہو رہی تھی جسے وہ نگلنے کی کوششیں کر رہا تھا۔

''میں سمجھ رہی تھی کہ وقت گزرنے پر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن یہاں حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اب مجھ میں برداشت کی تاب نہیں رہی۔ آج تو میری حالت یہ تھی کہ یوں لگتا تھا میں دفتر سے گھر واپس لوٹ بھی سکوں گی کہ نہیں۔ یہاں کس بلا کی ویرانی ہے۔ ویرانی اور سکوت اور خلا ہی خلا۔'' اور اب اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ تھرّا گئی۔ ''یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم چاند پر نکل آئے ہیں یا کسی غیر آباد سیارے پر۔ انسانی دُنیا سے بہت دُور۔''

ایک موٹر بوٹ نیچے چک چک کرتی گزر رہی تھی اور کشتی بان کے پائپ سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سُلگتے ہوئے تمباکو کی روشنی نکل رہی تھی۔

''تم غلطی کر رہی ہو ایلسے۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم صرف یہ سوچ رہی ہو کہ یہ جگہ کیسی ہے۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ یہاں کے لوگ کیسے ہیں؟ تم انھیں بھول رہی ہو۔'' اس نے اپنا

سر اُٹھایا، لیکن ایلسے کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا رہا۔

''لوگ؟'' ایلسے نے کہا اور اس کے ہونٹوں کے گوشے حقارت سے مُڑ گئے۔

''یہ کس قسم کے لوگ ہیں؟ میں روزانہ انھیں دیکھتی ہوں۔ ایچ۔ او میں ان کی خدمت کرتی ہوں اور یہ بس نوالے نگلتے ہیں، بیئر کے گھونٹ حلق سے اُتارتے ہیں۔ دبی زبان سے، سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہیں اور جب کسی کو اپنی میز کے پاس آتا دیکھتے ہیں تو فوراً موضوع بدل دیتے ہیں۔ نہ کبھی ہنستے ہیں، نہ مسکراتے ہیں۔ جب بل اُدا کرنا ہو تو بڑی بے دلی کے ساتھ مارک کے نوٹ نکالتے ہیں۔ بچے ہوئے پیسے واپس لیتے ہیں تو ایک ایک شلینگ احتیاط سے گنتے ہیں۔ پھر تھکے ہوئے بیزار اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور جب واپس جانے لگتے ہیں تو ان کے چہروں پر وہی بے رنگی، بے حسی، اُجاڑ پن اور درشتی ہوتی ہے۔

''ہاں'' اس نے کہا۔ ''یہاں لوگ ایسے ہی ہیں اور صبح میں S ٹریم میں انھیں دیکھتا ہوں تو وہ اور بھی زیادہ بے رنگ، بے جان اور پژمردہ نظر آتے ہیں۔ تم تصوّر کر سکتی ہو کہ اس وقت میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔ جب میں ٹریم کے کاریڈور میں کھڑا دیکھتا ہوں کہ لوگ ٹریم میں قطار در قطار، ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہیں، خاموش، اُونگھتے ہوئے۔ انھوں نے زندگی بھر ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی ہوگی۔ پھر بھی یوں محسوس ہوتا ہے کوئی بات ہے جو انھیں متحد اور یکجا کیے ہوئے ہے۔''

دُور کہیں سیٹی کی آواز آئی۔ وہ اس آواز کو سُن کر کسی سوچ میں کھوگئی۔ ہاں وہ تصوّر کر سکتی تھی کہ والٹر اس وقت کیا محسوس کر رہا ہے۔

''تم یہاں ٹھیک ہو، تمھاری بات اور ہے۔'' اُس نے کہا۔ ''تم ابھی تک انھیں برلن والوں کی حیثیت سے دیکھتے ہو لیکن والٹر، تم دیکھتے نہیں ہو کہ ایک مدّت سے ہم خود مُردہ ہو چکے ہیں۔ ہم پر بھی اسی طرح کی مُردنی اور ویرانی چھا گئی ہے۔ جیسے رات کے وقت یہاں کی سڑکوں پر چھا جاتی ہے۔ میں یہ دیکھ سکتی ہوں اور محسوس کر سکتی ہوں۔ ورنہ میری یہ آرزو کیوں ہوتی کہ میرے گردتیوں کی جگمگاتی روشنیاں ہوں۔ سجی ہوئی متوّرد کانیں ہوں۔ خوش باش جامہ زیب لوگ ہوں

اور ان کے ہنستے مسکراتے چہرے اور، اور..... زندگی میں بس تھوڑی سی راحت اور اطمینان ہو۔ یہاں تو یوں لگتا ہے جیسے ہم سٹیپ کے ویرانوں میں ہوں۔ ہم سُوکھ گئے ہیں۔ ہماری زندگی سے، ہمارے جسموں سے سارا رس نُچڑ چکا ہے۔'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس نے یہ محسوس کیا اور چُپ ہوگئی۔

والٹر نے ایک گہری سانس لی۔ ''اور اگر ہر کوئی یہی سوچے جو تم سوچ رہی ہو، اور وہی کرے جو تم کرنا چاہ رہی ہو، تو آخر کیا ہوگا۔ مشرقی برلن کون آباد رکھے گا؟ یقیناً وہ لوگ نہیں جو پارٹی کی باتیں کرتے ہیں بلکہ ہم مشرقی برلن کو زندہ اور آباد رکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ اصل برلن والے تو ہم ہیں، وہ نہیں۔''

''تم ایسی باتیں کر رہے ہو جیسے ہمیں کوئی اختیار ہے۔''

''تاہم ہمت سے سب کچھ برداشت کر لینا اور ثابت قدم رہنا کوئی کمزوری تو نہیں۔''

''لیکن میں سخت جان نہیں ہوں۔ مجھ میں برداشت کی ہمت نہیں رہی۔'' اُس نے نڈھال ہو کر کہا۔ ''میں ختم ہو چکی ہوں۔ دیکھو والٹر، میں یہیں پیدا ہوئی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ایلیسے، جو کچھ بھی گزرے تم یہیں رہو گی۔ مشرقی برلن کو ہماری ضرورت ہے۔ لیکن اب نہیں۔ اب مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔ ۴۵ء سے اب تک میں اپنی ساری قوت اپنے وطن مشرقی برلن کو دے چکی ہوں۔ میں سوچتی تھی کہ یہ قوت کبھی نہ کبھی مجھے واپس مل جائے گی۔ لیکن نہیں میری قوت مجھے کبھی واپس نہیں ملے گی۔''

''یہ تم پر منحصر ہے کہ تمھاری قوت عود کر آئے گی کہ نہیں۔'' والٹر نے یہ کہتے ہوئے اپنے سر سے کرفرسٹن پُل کی جانب اشارہ کیا۔ ''ادھر دیکھو اس دہکتے، شعلہ فشاں آسمان کی طرف اور یہاں اس آبِ رواں کی طرف۔ ان سب میں قوت ہے۔ تم چاہو تو ان سے قوت حاصل کر سکتی ہو۔''

''تم حاصل کر سکتے ہو، میں نہیں، میرا یہاں دم گھٹتا جا رہا ہے۔'' اس نے غصے سے کہا۔

والٹر نے پھر کچھ نہ کہا اور نیچے پانی کی طرف دیکھنے لگا۔ ایلیسے کو اب والٹر پر رشک آنے

لگا تھا۔

اب جانے کا وقت آ گیا تھا۔

''اچھا والٹر، میں جا رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ اپنی جگہ سے ہٹے بغیر۔ اس نے محسوس کیا والٹر کی سانس رُک گئی ہے اور کوئی چیز اس کے گلے میں اٹک رہی ہے، جسے وہ نگلنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن وہ اسی جگہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ ہاتھ باندھے ہوئے، جیسے اس کے بازو سیسے کی مانند وزنی ہوں۔

وہ آہستہ آہستہ صوفے کے پاس گئی اور اپنا سوٹ کیس اُٹھالیا۔ اب وہ اپنے اندر وہی خلا سا محسوس کر رہی تھی۔ کوئی ہیجانی کیفیت افسوس کا کوئی جذبہ اس کے دل میں نہ تھا۔

''خدا حافظ والٹر۔''

دروازہ بند ہو گیا۔ اس نے زینے پر بتی جلا کر روشنی کی اور نیچے اُتر گئی۔ نیچے صحن میں بھیگے کوئلوں اور گلی سڑی لکڑی کی بُو آ رہی تھی۔ اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ بغیر ایڑی کے جوتے پہن آئی ہے اور ہر قدم پر پتھروں کے درمیان اُونچی ایڑی کے اٹک جانے کا اندیشہ نہیں ہے۔ برائٹ سٹریٹ کی جانب سے ہوا سرسراتی چلی آ رہی تھی اور اُس میں ٹھہرے ہوئے پانی کی بدبو تھی۔ ایلسے مکانوں کے قریب ہو کر چل رہی تھی۔ کئی گھروں کی چھتیں گر گئی تھیں اور ان کے اُوپر آسمان یوں لگ رہا تھا جیسے بیا آکٹوپس کے بے شمار ہاتھ اور ان کے سوراخ اسے اپنی طرف کھینچ رہے ہوں۔

اور اب گھروں کی قطار ختم ہو گئی اور اب وہ مارکس انگلس سکوئر کے ویرانے میں نکل آئی۔ یہاں دُور دُور تک کسی انسانی رُوح کا نشان نہ تھا۔ اس کے پیچھے گرجا گھر کا تنہا قُبہ تھا۔ بمباری سے بُری طرح ٹوٹا ہوا قُبہ۔ اور اس کے گوشوں میں فرشتوں کی شبیہیں باجے بجا رہی تھیں۔ پُل کے اس جانب لگا ہوا ایک پھٹا ہوا پوسٹر پھڑ پھڑا رہا تھا اور اس پر کوئی ٹیڑھی میڑھی تحریر نمایاں تھی۔ اب یہ یاد کرنے سے کوئی فائدہ نہ تھا کہ کسی زمانے میں یہاں ایک محل کھڑا تھا اور ابھی نو مہینے پہلے یہاں کرسمس بازار لگا تھا۔ اس وقت الٹرا وائلٹ حرارت سے سڑک کو گرم کیا گیا تھا۔ یہاں دُکانیں تھیں

اور بڑے بڑے گتے کے بونے کھڑے کیے گئے تھے۔ یہ دیوقد بونے سرخ فوجیوں کی یاد دلا رہے تھے۔ اب یہاں ہر جانب ویرانی اور سناٹا تھا۔ ایلسے اپنا سوٹ کیس مضبوطی سے تھامے کو پفر گرابن پُل کی طرف بڑھ گئی۔

ایک بس اُنٹر ڈین لنڈن سے گزر گئی اور ایلسے نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بس کے دریچوں کے پیچھے بے رنگ اور اُداس چہروں کو دیکھا۔

آرسنل کے بعد اب فضا کچھ بہتر ہو چلی تھی۔ یہاں سڑک کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ لِنڈ کے درخت سرسرا رہے تھے۔ یہاں کچھ لوگ بھی اِدھر اُدھر چل رہے تھے اور "جنگ کی یادگار" کے قریب تسانگ ہاؤس کے پاس ایف، ڈی، جے یونیفارم پہنے ایک جوڑا کھڑا تھا اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اُداسی سے اپنے پیچھے نشیب کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اب یہاں یادگار سے پھر شعلہ بلند ہوگا، جیسے پہلے ہوا کرتا تھا، ایلسے نے سوچا۔ چلتے چلتے وہ ماضی کا تصوّر کرنے لگی جیسے وہ پھر سکول کی لڑکی بن گئی ہو اور دوسری لڑکیوں کے درمیان گھری ہوئی آرسنل کے دریچوں سے گارڈ کی تبدیلی کا منظر دیکھ رہی ہو۔ فولادی خود پہنے، اپنی گردنیں اُونچی کیے یہ گارڈ پُتلوں کے سے لگتے تھے اور والٹر انھیں گارڈ کے سامنے سیلوٹ کیا کرتا تھا۔

براانڈن برگ گیٹ کے، سوراخوں سے چھلنی، ستون روشنیوں سے جگمگائے گئے تھے۔ درختوں کے پتوں کے درمیان وہ انھیں دُور سے دیکھ سکتی تھی اور اس کے بعد، بعینہٖ اس دروازے سے پار ہونے کے بعد اس کے لیے نئی زندگی شروع ہوتی تھی۔ دراصل یہاں سے کوئی نئی بات شروع نہیں ہوتی تھی۔ یہی شہر برلن وہاں بھی تھا۔ وہاں بھی وہی گھاس پات اُگتے تھے۔ چڑیا گھر میں بھی وہی کوّے بولتے تھے، جیسے یہاں شنکل پلاٹنر کے درختوں میں بیٹھے بولا کرتے تھے۔ وہ باورچی خانے کی کھڑکی میں سے یہی کچھ دیکھ سکتی تھی۔

اس کے باوجود اس پار ایک نئی دُنیا شروع ہوتی تھی۔ وہاں کی ہوا تک میں آزادی تھی، مکمل آزادی۔ شاید ابھی نہیں، لیکن اس فضا میں ایک اُمید تھی۔

میں وہاں کوئی نہ کوئی کام ڈھونڈ لوں گی۔ اس نے سوچا۔ خواہ مجھے صفائی ہی کرنی پڑے۔

جب وہ فریڈرش سٹریٹ میں مڑی تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ یہاں زندگی تھی۔ کچھ بے فکرے نوجوان چوڑے پائنچوں کی پتلونیں پہنے، ٹائیاں لگائے، سر پر لانبے لانبے بال رکھے، ڈانس پیلس کے سامنے کھڑے گنگنا رہے تھے اور موسیقی کے آہنگ پر تھرک رہے تھے، گھوم رہے تھے۔

ایلسے چلتے چلتے نیون روشنیوں میں اس تحریر کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی جو ریلوے پُل پر آہستہ آہستہ نمودار ہو رہی تھی۔ کہیں کسی کا استقبال کیا گیا تھا۔ وفد میں آنے والوں کے لیے تو سارا معاملہ ہی ٹھیک تھا۔ ایک اور ہی رُخ ان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔

وہ زینے پر چڑھ کر ٹکٹ آفس تک پہنچی۔ ''ایک بیس کا ٹکٹ دیجیے'' اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی ٹیوب کے اندر سے بول رہی ہو اور وہ حیران سی ہوئی جب کھڑکی کے پیچھے کھڑی عورت نے فوراً اسے ٹکٹ پکڑا دیا۔ کیا اس عورت کو یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے دوسری طرف جارہی ہے اور مشرقی برلن کی ریپبلک سے بھاگ رہی ہے؟''

ہاں، لوگوں نے اس کے بارے میں کچھ محسوس تو کرلیا تھا اور پلیٹ فارم پر ٹرانسپورٹ پولیس کا ایک آدمی بھاری قدموں سے اس کے پیچھے آیا۔ یہ اس کے سُوٹ کیس کی وجہ سے تھا۔ حالانکہ اس کے سُوٹ کیس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف دو ایک جوڑے، زیر جامے، دُھلائی کے کپڑے اور ایک ہاتھ ٹوٹی گڑیا!

غالباً وہ آدمی کچھ اور سوچ کر آیا تھا۔ کیونکہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جب روشنی ایلسے کے چہرے پر پڑی تو اُس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور وہ سیٹی بجاتا ہوا اس کے پاس سے گزر گیا۔ ایلسے ایک فلم پوسٹر بورڈ کے سہارے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی اور تھوڑی دیر کے لیے اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

اسی وقت ٹرین آگئی اور پھر اب وہ اس آواز کے ساتھ تھی، جو اس کے خوابوں کی آواز تھی۔ لاؤڈ سپیکر پر آواز آئی:

''فریڈرش سٹریٹ، ڈیموکریٹک سیکٹر کا آخری سٹیشن۔''

''آمین!'' ایلسے نے چپکے سے دل میں کہا۔

وہ ٹرین میں دریچے کے پاس ایک سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بالکل اکڑی ہوئی اور اس کے ہاتھ سوٹ کیس کو اتنی سختی سے تھامے ہوئے تھے کہ اُس کی اُنگلیوں کے پورے سفید پڑ گئے تھے۔ اب مجھے کچھ سوچنا نہیں چاہیے۔ اپنے چہرے پر کسی طرح کے جذبہ کا اظہار نہ کرنا چاہیے۔ صرف بے پروائی کا اظہار ہو ورنہ وہ مجھے اب بھی ٹرین سے اُتار باہر کر سکتے ہیں۔

نہیں اب کچھ نہیں ہوگا۔ دروازہ بند ہو چکا تھا اور ٹرین چلنے لگی تھی۔ کمپارٹمنٹ میں کوئی بھی اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اب اچھی طرح اس بارے میں سوچنا چاہتی تھی کہ وہ کیا کر رہی ہے لیکن وہ اس کے سوا اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ اب S ٹریم میں ہے۔

اور اچانک دریچے کے شیشے میں اس کے اپنے ہلکے عکس کے اندر سے برلن اس کی نظروں کے سامنے سے گزرتا جا رہا تھا۔ یہ رائشستاغ تھا جس کے فولادی گھوڑوں کے صرف ڈھانچے رہ گئے تھے اور ان کے سوار ٹوٹ پھوٹ کر غائب ہو چکے تھے۔ کوئلوں کے ڈھیر دریائے شپرے کے کنارے اور ہُمبولٹ بندرگاہ پر لگے ہوئے تھے اور اس کے پیچھے اینٹوں کے بنے مکان، لیہرتر ریلوے سٹیشن، موابٹر گودام اور چڑیا گھر کے اس پار گویا ان گنت ستاروں کی روشنی سے چمکتا ہوا وہ دوسرا برلن، منور، روشن برلن جہاں مسرت تھی۔ وہ برلن جس کے لیے سب دلوں میں حسرت تھی۔ ایلسے اپنی پیشانی دریچے کے شیشے سے چپکا کر اس برلن کو دیکھ رہی تھی۔

ہاں، یہ وہی برلن تھا جو اب اس کے اِردگرد پھیلا ہوا تھا، ہو سکتا ہے کہ ان روشن کمروں میں سے ایک کمرہ کسی دن مجھے کام کے لیے ملے اور مجھے اس کی صفائی کرنی ہو۔ اس نے سوچا۔

وہاں کے لوگوں میں گھر جانے کے لیے وہ ابھی تیار نہ تھی۔ لیکن وہ بیل و یو ہی سے ٹرین پر چڑھ آئے۔ ہنستے ہوئے، خوش لباس، جامہ زیب جوڑے، سمارٹ، صاف ستھری لڑکیاں، بھرے بھرے شفاف چہروں والے نوجوان جن کے جوتے اچھی طرح پالش کیے ہوئے تھے اور اتنے صاف اور اُجلے کہ ان کی سفیدی آنکھوں کو تکلیف دیتی تھی۔ یہ لوگ جنت سے آئے تھے۔

یہ عجیب بات تھی۔ گو ایلسے ان خوش باش لوگوں کو دیکھنے اور ان کے درمیان زندگی گزارنے کی کب سے آرزو رکھتی تھی، لیکن اب انھیں پاس دیکھ کر اسے کوئی خوشی محسوس نہیں ہو رہی

تھی۔ کوئی فائدہ نہیں، کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ کوئی چیز اس کی خوشی میں حائل تھی۔ اس آدمی، اس چھوٹے سے مرد کی یاد جس کے جسم سے مطبخ کی رُوشنائی کی بُو آتی تھی اور جو اپنے ہاتھ باندھے چُپ چاپ اس پار دیکھا کرتا تھا۔

اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اپنے اندر ایک بس گزری ہے جس میں وہی بے رنگ اُداس چہرے ہیں، پچکے ہوئے گال اور دھنسی ہوئی آنکھیں۔ یہ آنکھیں بس کے دریچوں کے پیچھے سے گھور رہی ہیں۔

اور اب اس کی نظروں کے سامنے ہنسا ڈسٹرکٹ گزر رہا تھا۔ اُونچی اُونچی عمارتیں، چندھا دینے والی تیز روشنیاں اور ان سے منوّر رہائشی اپارٹمنٹ تہ بہ تہ جمے ہوئے جیسے یہ بہت سارے بھڑ کے چھتے ہوں۔ آسمانوں کو چھوتے ہوئے سکائی سکریپرز۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے اپنے چہرے کے عکس کے اندر بے شمار دریچے، دروازے ہیں۔ دریچوں کے پردے ہیں۔ زینے اور بالکونیاں ہیں اور اس کا چہرہ شیشے میں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور گویا اس سے پوچھ رہا تھا: ''تم یہاں کیا کر رہی ہو، ایلیسے؟''

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ایچ او کے باورچی خانہ کا تصوّر کرنے لگی جہاں وہ کام کیا کرتی تھی۔ چولھوں سے اُٹھتی ہوئی تیز بھانپ مختلف کھانوں کی مِلی جُلی بُو جس سے اُبکائی آتی تھی۔ وہ الماری، جہاں وہ اپنا ایپرن لٹکایا کرتی تھی اور دوسری ساتھی عورتوں کے تھکے ہوئے پژمردہ چہرے۔

اس نے اپنے آپ کو کہتے سُنا۔ ''اپنی شناخت کا کارڈ دکھایئے۔ جب کوئی گاہک اسے آرڈر دیتا تھا تو میکانکی آواز میں وہ یہی سوال ہر بار دُہراتی تھی۔ وہ ان گاہکوں کا بھی تصوّر کر سکتی تھی۔ وہی بے رنگ ایک سے چہرے۔ وہ یہ سب کچھ اتنا صاف اور واضح دیکھ رہی تھی جیسے یہ سب کچھ حقیقتاً اس کے سامنے ہو رہا ہو لیکن اس کی تکان، متلی کا احساس، کراہت اور نفرت غائب ہو گئی تھی۔

وہ لوگ جو وہاں بیٹھے ہوئے تھے، اس کی اپنی طرح کے لوگ تھے، بے شک وہ تھکے

ہوئے تھے، نڈھال تھے، کسی بوجھ سے ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے لیکن وہ برلن کے باشندے تھے۔ برلن کے اصل باشندے جو وہیں مشرقی برلن میں پیدا ہوئے تھے۔ اور ساری سختیوں کو صبر و تحمل سے برداشت کر رہے تھے۔ وہ مشرقی برلن سے بھاگ نہیں رہے تھے۔ ثابت قدمی سے ان کے پاؤں الگزینڈر سکوئر میں جمے ہوئے تھے۔ وہ اپنی اُجاڑ گلیوں کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ انھیں اپنے جنگ سے برباد شدہ، شکستہ گھر اور آنگن عزیز تھے۔ یہ ضرور ہے کہ انھیں کے درمیان وہ ضابطہ پرست حاکم بھی تھے، پارٹی کے بڑے کارکن بھی۔ اور ان کے کٹھ پتلے بھی تھے لیکن ان کی حیثیت ہی کیا تھی؟ کچھ بھی نہیں۔

''اصل برلن والے تو ہم ہیں۔'' اس کے اندر سے کوئی آواز آئی۔ ہم ہیں، وہ نہیں۔

اور اسی لمحہ اسے احساس ہوا کہ یہ والٹر کی آواز تھی اور اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

باہر رات روشن ہوتی جا رہی تھی۔ اشتہاروں کی روشنیاں یکے بعد دیگرے سامنے آ رہی تھیں۔ سبز، سرخ اور زرد روشنیاں۔ اخبارات کے سٹالوں پر بڑی تیز روشنی ہو رہی تھی۔ ایک اُونچی عمارت کا ایک رُخ اچانک یوں سامنے آیا جیسے آسمان کی جانب ایک شعلہ سا لپکا ہو۔ ریل گاڑی سٹیشن پر رُکی تو پھر بہت سے آدمی اس میں داخل ہوئے۔ بنے سنورے، رنگ برنگے کپڑے پہنے، زندہ دل لوگ۔ یہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے، ایلسے اپنا سوٹ کیس مضبوطی سے تھامے اُٹھ کھڑی ہوئی اور ٹرین سے اُتر گئی۔

ہاں یہی وہ نسو (ریلوے سٹیشن) تھا جو اُس کے خوابوں میں اس کی نئی زندگی کا نقطۂ آغاز ہوا کرتا تھا اور اب کہ وہ یہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ میں ابھی تک خواب دیکھ رہی ہوں۔ اپنا رستہ بھول آئی ہوں۔ میں یہاں اجنبی ہوں۔ یہ ڈبّا نما عمارتیں کیسی ہیں؟ میں کہاں ہوں؟ جیسے میں کسی اجنبی دُنیا، بلکہ چاند پر نکل آئی ہوں۔

وہ نڈھال سی ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں جلتے ہوئے آنسو تھے۔ آنسو بھری آنکھوں سے وہ سڑک کے اس پار دیکھ رہی تھی۔ یہ جگمگاتی ہارڈن برگر روڈ اور میموریل چرچ جیسے روشنیوں سے جگمگایا تھا اور یہ اُونچے اُونچے سکائی سکریپرز۔ اس کے لیے یہاں آرام اور سکون کی

جگہ کہاں تھی؟

یہاں کے لوگ، اس نے سوچا۔ نہیں، نہیں میں نے یہاں بھی غلطی کی ہے، لوگ یہاں بھی ہیں۔ لیکن......

ہاں، یہاں بھی لوگ تھے۔ سینکڑوں ہی آدمی پلیٹ فارم پر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ بار کے سامنے کھڑے تھے۔ سگریٹ پی رہے تھے۔ کتابیں پڑھ رہے تھے۔ کچھ خاموش تھے اور کچھ باتیں کر رہے تھے لیکن یہ اجنبی تھے۔ ان کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہ تھا جو ایلسے کی روزمرّہ کی زندگی کے ساتھی تھے۔ ایچ او کے ہجوم کے ساتھ ان لوگوں کو کھڑا کیا جائے تو یوں لگیں گے جیسے پکچر پوسٹ کارڈ سے باہر نکل آئے ہوں۔

تمھیں کیا ہوا ہے ایلسے؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ یہاں وہ خوشی ہے، روشنی ہے، جس کی تم آرزو رکھتی تھیں۔ اب تم خوش ہو جاؤ، خدا کے لے!

اس نے اپنے دل میں خوشی محسوس کرنے کی بہتیری کوشش کی، لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس بات کی خوشی محسوس کرے اور اس وقت اچانک اس کے ذہن میں آیا کہ وہ صرف چار سٹیشنوں سے گزر کر یہاں آئی ہے۔ وہ اسی طرح چار سٹیشن پیچھے جا کر واپس اپنے ملک میں پہنچ سکتی ہے۔ چار سٹیشن جانے کے بعد وہ پھر وہی آواز سُنے گی۔ ''فریڈرش سٹریٹ' یہ ڈیموکریٹک سیکٹر کا آخری سٹیشن ہے۔'' لاؤڈ سپیکر پر یہ آواز رات کی گہرائی میں بھی سُنائی دے گی۔

جب وہ دوبارہ ریل گاڑی پر سوار ہوئی تو وہ دبی دبی اور خاموش خاموش سی تھی۔ اس نے اپنا سوٹ کیس بے پروائی سے سامان کے ریک پر پھینک دیا اور خود دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ ٹرین چلنے لگی اور پھر ذو ڈسٹرکٹ کی روشنیاں اس کے سامنے آ گئیں لیکن اب وہ کوپفر گرابن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہاں کوپفر گراس پر ایک چھوٹا سا مرد جس کے جسم سے مطبع کی رُوشنائی کی بُو آتی تھی، اُنسل پُل کے پاس کھڑا مچھلیاں پکڑ رہا ہوگا۔ وہ چپکے سے اس کے پیچھے جا کھڑی ہوگی۔ یہی بہتر تھا۔ وہ اس آدمی کو اچھی طرح جانتی تھی اور اس کے ساتھ رہ کر وہ سب کچھ بھول سکتی تھی۔

جون ۱۹۶۳ء

وہ کوپفرگرابن پر نہر کے پاس کھڑا نیچے پانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مچھلی پکڑنے کی ڈور اندر ڈالے ہوئے، وہ اپنے بازو میں نہر کے منبع کی جانب سے پانی کے پُرزور بہاؤ کو محسوس کر رہا تھا۔

راگ گہری ہو چلی تھی۔ دوسری جانب مارکیشن اُفر میں دریچوں کے اندر کی روشنائیاں ایک ایک کر کے بُجھ چکی تھیں۔ صرف اِنسل پُل کے دونوں جانب گیس لیمپ جل رہے تھے۔ گہرے کالے پانی کے اندر سے کبھی کبھی کوئی شعلہ سا لپکتا دِکھائی دیتا۔ یہ روشنی اس کا عکس تھا جو بندرگاہ پر کھڑے کسی جہاز سے ادھر پھینکی جا رہی تھی۔

اس سے غلطی ہوگئی تھی۔ اسے چاہیے تھا کہ معمول کے مطابق جلد لوٹ آتا لیکن وہ نائٹ شفٹ والوں سے بحث میں اُلجھ گیا تھا۔ اور آخر میں ان سب کو غصہ آ گیا تھا۔ کیونکہ مطبع کی مشینوں کی آواز اتنی اُونچی تھی کہ ایک دوسرے کی بات سُننے کے لیے انھیں زور زور سے چلاّنا پڑ رہا تھا۔

مگر وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ پورے پندرہ سال روٹری آپریٹر کی حیثیت سے وہ ایک ہی فرم میں کام کر رہا تھا۔ سلنڈرز پر پھسلتے ہوئے کاغذات کو مسلسل دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھیں تھک گئی تھیں۔ یہ کاغذات کے نہ ختم ہونے والے رول اور گرم تیل اور رُوشنائی کی وہ تلخ اور تیز بُو جس سے اس کی سانس رُک جاتی تھی انھیں کے درمیان اس کی زندگی گزر رہی تھی۔

اور جہاں تک اس کے ساتھیوں کا تعلق تھا، دو ایک ان میں اس کے پُرانے ساتھی بھی تھے۔ جنھوں نے اس کے ساتھ شرل بن سیلر شرل میں کام سیکھنا شروع کیا تھا۔ یہ فرم ان دنوں شٹسن سٹریٹ کے نکڑ پر واقع تھی۔ بالکل اسی جگہ جہاں آج "دیوارِ برلن" کھڑی تھی۔ ایک دن ان میں سے ایک ساتھی اس کے پاس چلا آیا تھا۔ اسٹیشن ڈے تھا یا کوئی اور تہوار۔ بہرحال اس موقع پر وہ دونوں مصنوعی ناکیں لگائے، ہارمونیکا اُٹھائے بس میں چڑھ گئے تھے اور انٹرڈن لنڈن اور بران ڈگ برگ گیٹ کی طرف چل پڑے تھے۔ اس وقت اسے اس بے فکر زندگی کے وہ لمحے یاد آ رہے تھے۔

خصوصیت سے اس دن اسے چُپ رہنا چاہیے تھا۔ بہت زیادہ باتونی ہونے سے لوگوں کو یہ شک پڑتا ہے کہ ضرور کوئی غیر معمولی بات ہے اور اس نے اپنے ساتھیوں کے چہروں پر یہ شک دیکھ لیا تھا۔

اس کے پیچھے کولون مچھلی مارکیٹ کی جانب سے گڑگڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ یہ اس ٹرام کی آواز تھی جو موس دام پُل پر سے نیچے اُتر رہی تھی۔ پھر اس کے بعد سپٹل مارکیٹ تھی۔ پھر ڈون ہاف پیالئز، فریڈرش سٹریٹ ڈلیلم سٹراز، پھر اس کے بعد ٹرام اس ویرانے میں آ کر رُک جاتی تھی۔ درتھیم سٹور کے عین سامنے جواب محض ایک کھنڈر رہ گیا تھا اور یہاں سے ڈرائیور اور کنڈکٹر پھر واپسی کی تیاری شروع کرتے تھے۔

ٹرام یہاں رُک جاتی تھی لیکن ٹرام لائنوں کا سلسلہ آگے چلا گیا تھا اور اصل نکتہ بھی یہی تھا۔ یہ لائنیں ری پبلک سے مشرقی برلن سے، گویا فرار ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ لائنیں سٹیٹ کی نظروں سے بچ کر کوموفلاج کر کے، دیوارِ برلن کے نیچے سے رینگتی ہوئی چلی گئی ہیں اور عوامی پولیس ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور دوسری طرف وہ چمکتی ہوئی نمودار ہوتی ہیں اور دوسری ٹراموں کے پہیوں کے نیچے اپنے آپ کو ڈال دیتی ہیں۔

والٹر نے اپنا مچھلی پکڑنے کا آلہ نہر کی ریلنگ کے سہارے لگا رکھا تھا۔ تاہم اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ جب کبھی وہ دوسری طرف جاتی ہوئی ٹرام کی لائنوں کے بارے میں سوچتا تھا تو اس کا ہاتھ یونہی کانپا کرتا تھا۔

لیکن آج اسے کسی اور بات کا بُری طرح احساس ہو رہا تھا۔ پوسٹ ڈامر پلاٹنر اندھیرے میں اس کی نگاہوں کے سامنے اُبھری۔ جہاں کہیں بھی وہ نظر ڈالتا تھا اس کے سامنے ویرانی ہی ویرانی تھی۔ یہاں ایک خندق تھی اور ریلوے ٹریکوں سے بنے ہوئے بریکیڈ لوہے کی جالیاں اور ان کے آگے ایک دوسری مضبوط دیوار اور دیوار کے پیچھے ایک اُونچا ٹاور، جس پر مغربی سیکٹر کی خبریں فلیش ہو رہی تھیں۔ لیکن یہ خبریں کس کے لیے تھیں؟ یہاں زندگی نہ تھی۔ صرف دُکھ اور موت تھی۔ والٹر اپنی آنکھیں بند بھی کر لیتا تو اسے اپنے اندر سٹیپ کی سی ویرانی محسوس ہوتی۔ وہ

ٹرام لائنیں بھی جو دوسری طرف چلی گئی تھیں۔ اس نا اُمیدی کے احساس کو کم نہ کر سکتی تھیں۔ کیونکہ یہ بھی کسی منزل کی طرف نہ لے جاتی تھیں۔

یہ سب کچھ سوچنا بند کر دو۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اس نے ڈور باہر کھینچ لی۔ کیڑا بدستور کانٹے سے لگا کلبلا رہا تھا۔ کوئی مچھلی پھنس نہیں رہی تھی۔ اس نے دوبارہ ڈور پانی میں ڈال دی۔ یہ آخری بار ہے۔ اب کے بھی کوئی مچھلی نہ پھنسی تو میں چلا جاؤں گا۔ اس نے سوچا۔

وہ اپنے جسم کا سارا بوجھ نہر کی ریلنگ پر ڈالے ہوئے تھا۔ وہ اس جگہ کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں اس کی ڈور شفاف پانی کے آئینے کے اندر چلی گئی تھی۔ گہرے کالے پانی میں ڈور کو نظر میں رکھنا مشکل تھا۔ دبیز تاریکی کے علاوہ اُوپر دھند کی تہ بھی جمی ہوئی تھی۔ اب وہ پانی کے آئینے میں اپنا عکس بھی نہیں دیکھ سکتا تھا اور ان اُداس لمحوں میں اس کا عکس ہی اس کا ساتھی ہو سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ اپنے آپ کو یہ یقین دِلا سکتا تھا کہ جب وہ خود یہاں سے چلا جائے گا تو اُس کا عکس کو پفر گرابن میں باقی رہے گا اور مچھلیاں اس کے عکس کے نیچے تیرا کریں گی۔ نہر پر گرتی ہوئی بارش بھی اس کے عکس کو مٹا نہ سکے گی۔

شاید اس کا عکس ہی نہیں تھا۔ اس نے سوچا۔ جو کچھ ہر صبح اسے شیونگ کرتے ہوئے آئینہ میں نظر آتا تھا محض ایک دھوکا تھا، سُراب تھا۔ ان آخری دو برسوں میں اس کے عکس کے علاوہ بہت کچھ اور بھی کھو گیا تھا۔

اس نے اپنا سر اُٹھایا۔ اس کے پیچھے قدموں کی چاپ سُنائی دے رہی تھی۔ رُوف سٹراز سے نیچے اُترتے قدموں کی چاپ۔ اس نے پہچان لیا کہ یہ عورت کے قدموں کی چاپ ہے۔ اس نے اپنی سانس روک لی۔ لیکن نہیں...... ہو جو کوئی بھی تھی، خاصا وقت لے رہی تھی۔ یوں بھی وہ اس کے ارادے کیسے جان سکتی تھی۔ حسبِ معمول وہ اپنی سائیکل اور مچھلی پکڑنے کا سامان لے کر چلا آیا تھا۔ جیسے وہ ہر شام کیا کرتا تھا۔ باورچی خانہ کے شیلفوں میں اس نے کچھ اِدھر اُدھر تلاش کیا تھا اور بس۔

اور وہ قدم روف سٹراز پُل تک پہنچے۔ یہاں وہ کچھ دیر رُکے اور پھر آہستہ آہستہ آگے

بڑھتے گئے۔ تو یہ وہی تھی۔

اس نے ڈور کی طرف دیکھا۔ ڈور تنگ کسی ہوئی تھی۔ اس نے ڈور اُوپر کھینچی اور اسے محسوس ہوا کہ ڈور کے سرے پر پھنسی ہوئی ایل مچھلی تڑپ رہی ہے، پھڑک رہی ہے۔ اس کے بازو میں بجلی کی ایک لہر سرایت کر گئی۔ جب کبھی کوئی بڑی مچھلی پھنسی تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ اب ایل مچھلی تیر کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ والٹر بھی اسے ڈور کی لمبائی دے رہا تھا تاکہ وہ آسانی سے تیر سکے۔ اس پر مچھلی پریشان ہوگئی اور واپس لوٹ آئی۔ والٹر نے ڈور آہستہ آہستہ لپیٹ لی اور جب ایل اس کے بالکل نیچے آگئی تو اس نے ڈور اُوپر کھینچ لی۔ کتنا ہی تڑپے، مچلے اب وہ بچ نہیں سکتی تھی۔ مچھلی پانی سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کا سفید پیٹ چمک رہا تھا۔ والٹر نے مچھلی کو جال میں پکڑ لیا۔

"بڑا شکار ہے۔" ایلیسے نے کہا اور والٹر کو اب احساس ہوا کہ ایلیسے اس کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی ہے۔

"ہاں" والٹر نے جواب دیا۔ "اس کا دو پاؤنڈ وزن تو ہوگا۔"

تڑپتی مچھلی کو اس نے ایک کپڑے سے پکڑا اور کانٹا اس کے مُنھ سے نکال لیا۔ اور پھر اس کے وجود میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ جیسے مچھلی کے جینے کا عزم اس میں سرایت کر گیا ہو۔

والٹر نے مچھلی اس ڈبے میں ڈال دی جو سائیکل کے پیچھے کیریر سے بندھا ہوا تھا۔

کوئی چارہ نہیں۔ مجھے اپنا وعدہ توڑنا پڑے گا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"عجیب بات ہے۔" ایلیسے نے کہا۔ "کچھ دِنوں سے جب تم پانی میں دیکھتے ہو تو تمھاری آنکھوں میں غیر معمولی کیفیت ہوتی ہے۔"

"اچھا، تمھارا یہ خیال ہے۔" اس نے ایلیسے سے نظر نہیں ملائی۔

"جیسے تم کچھ ڈھونڈ رہے ہو۔ کوئی چیز جو پہلے تمھارے پاس تھی۔ جسے اب تم کھو چکے ہو اور ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

وہ خاموش رہا۔ مچھلی پکڑنے کا سامان مضبوطی اور احتیاط سے تھامے وہ یہ کوشش کرتا رہا

کہ اس کے ہاتھ نہ کانپیں۔

وہ کہرے کی نمی میں سانس لیتی رہی۔ ''کیا بات ہے والٹر؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے کہا۔

''کوئی بات ضرور ہے۔کوئی خیال تمھیں ستا رہا ہے۔ میں بہت دیر سے یہ محسوس کر رہی ہوں۔''

وہ ابھی تک اپنے کام کرنے کے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ کیونکہ اس کے کپڑوں سے باسی کھانوں کی بُو آ رہی تھی۔ وہ اپنی دیر کی شفٹ ختم کر کے گھر گئی تھی تو انھیں کپڑوں پر صرف ایک کوٹ ڈال کر یہاں چلی آئی تھی۔

''تمھیں سو جانا چاہیے تھا ایلسے، تم جانتی ہو میں اِن دنوں کتنا کم سوتا ہوں۔''

''ہاں، میں سو جاتی، لیکن میں نے کچھ دیکھ لیا تھا۔''

''کچھ دیکھ لیا تھا؟'' اس نے پہلی مرتبہ ایلسے کی طرف دیکھا۔ اس نے محسوس کیا اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے ایلسے سے سب کچھ چھپا رکھا تھا۔ سب کچھ اپنے ذہن میں جمع کرتا رہا تھا۔ حتّٰی کہ اس کے خیالات ایک دبیز بادل کی طرح ایلسے کے تھکے ہوئے، پژمردہ چہرے کے سامنے تن گئے تھے۔

''اچھا تم نے کیا دیکھ لیا تھا؟''

''تمھیں یاد ہے باورچی خانہ کے ایک دراز میں ہم نے دس ویسٹ مارک کا ایک نوٹ رکھ چھوڑا تھا۔''

ہاں، اسے یاد تھا۔ یہ نوٹ انھوں نے یادگار کے طور پر ایلسے کی حساب کی کاپی میں رکھا تھا۔ آج شام اس نے یہ نوٹ دیکھا تھا۔

''یہ نوٹ غائب ہے۔'' ایلسے نے کہا۔

دوسری جانب مارکیشن اُفر سے ایک آبی پرندہ پَر پھڑ پھڑاتا اُڑا۔ ایک دُکھ بھری کُوک اس کے گلے سے نکلی اور وہ پھر نہر کی ریلنگ پر جا بیٹھا۔

''اور تمھیں پتہ ہے نوٹ کے علاوہ اور کیا چیز غائب ہوگئی ہے؟''

وہ تصویر۔ والٹر نے سوچا۔ میں نے غلطی پر غلطی کی ہے۔ ایسے معاملوں میں، میں بالکل اناڑی ہوں۔ مجھے وہ تصویر نہیں لینی چاہیے تھی۔ خاص طور پر وہ تصویر!

''ہماری شادی کی وہ تصویر'' ایلسے نے کہا۔ ''پوسٹ کارڈ سائز کی تصویر جو باورچی خانہ میں شیشہ کے پیچھے رکھی تھی۔ نوٹ کی طرح وہ بھی غائب ہے۔''

''اچھا یہ بات ہے؟'' والٹر نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس پر بالکل تعجب نہیں ہوا'' ایلسے نے بے خیالی میں تھیلے کو تھپکی دی جو سائیکل سے لٹک رہا تھا۔ اس تھیلے پر مچھلی کے کھپرے جمے ہوئے تھے اور اسی تھیلے میں والٹر نے اپنا سامان پیک کر رکھا تھا۔

''میں اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مغربی پیسے یہاں تمھارے کسی کام نہیں آسکتے اور تصویر بھی تم نے اس لیے لی ہے کہ تمھارے پاس یادگار کے طور پر رہے۔'' اس کے گلے میں کوئی چیز اٹکتی محسوس ہو رہی تھی جسے وہ نگلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''اس سے ایک ہی مطلب، ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے اور وہ بڑا سنگین ہے۔ والٹر! تم یہاں سے فرار ہونا چاہتے ہو۔''

''لیکن دیکھو، میں یہاں مچھلیاں پکڑ رہا ہوں۔'' والٹر نے کہا۔

اس کے لہجے میں ایک تناؤ تھا۔

''اس سے یہ اندیشہ اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے جب کوئی بات بگڑتی ہے، تم ہمیشہ مچھلیاں پکڑنے چلے جاتے ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے اس شغل سے تمھارا ذہن اس بات کی طرف سے ہٹ جاتا تھا اور اب تم اپنے حواس جمع کرنے کے لیے یہ شغل اختیار کرتے ہو۔''

ہلکی ہلکی ہوا بہنے لگی۔ ہوا مارکس انگلس پلانٹر کی جانب سے سیمنٹ کی بُو لے آئی تھی اور ایک لاری کی گڑگڑاہٹ کی آواز۔

''کچھ کہو والٹر۔'' اس کی آواز ٹوٹ گئی تھی اور مشکل سے سُنائی دے رہی تھی۔

''کہو، کہ یہ سب کچھ ایک خواب ہے۔''

اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ ''یہ خواب نہیں ہے، ایلسے! خواب میں ہم کم از کم چیخ تو سکتے ہیں۔''

''میں اب بھی پکار اُٹھوں گی۔''

''یوں نہ کرو ایلسے! سوچو تو تمھاری آواز کن لوگوں کے کانوں میں پڑے گی اور ان لوگوں کے بارے میں سوچو جو بے قابو ہو کر پکار اُٹھتے تھے اور ان کا حشر کیا ہوا؟''

ایلسے اپنی کہنیاں نہر کی ریلنگ پر ٹکائے نیچے پانی میں دیکھ رہی تھی۔ وہ خاموش رہی۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو، میں نے ہر طرح کوشش کی کہ حالات کے ساتھ نباہ کر سکوں۔ پروپیگنڈا کلاسوں میں حاضری دی۔ پارٹی کے سیاسی لکچر سُنے۔ فوجی تربیت حاصل کی۔ حتیٰ کہ چھوٹی موٹی جاسوسی بھی کی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب کچھ جھوٹ تھا۔ میں نے بارہا اس جھوٹ کو سہارا لیکن اب مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا۔ مجھ سے ان پولٹ بیورو والوں کے لکچر نہیں سُنے جاتے۔ بہتر ہے کہ میرا یہ ہاتھ مشینوں میں آ کر پچک جائے، بجائے اس کے کہ اس ہاتھوں سے میں رائفل پکڑوں۔ جب کبھی کوئی چھٹ بھیّا افسر بیر سے بدبودار سانس مجھ پر چھوڑتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے اُس کے مُنھ پر مُکّا دے ماروں۔ اسی خوف سے میں کینٹین کی سلاخوں کو سختی سے پکڑے رہتا ہوں۔ میرا چیخ اُٹھنے کو جی چاہتا ہے جب یہ الفاظ میں بار بار سُنتا ہوں۔ ''لازمی کوٹا اور پروڈکشن پروگرام۔ یہ سب کچھ بھلا انسانوں کے لیے ہے؟''

ایلسے نے گہری سانس لی۔ ''میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ لیکن پھر بھی بہر حال ہماری زبان ان کی زبان سے مختلف ہے اور ہمارے وجود کے کچھ ایسے نہاں گوشے ہیں جسے کوئی چھٹ بھیّا افسر چھو نہیں سکتا۔ خواہ وہ جو کچھ بھی کرے اور جہاں تک رائفل پکڑنے کا تعلق ہے، تم بے وقوف یا بزدل تو نہیں ہو۔ کیا تم بغیر کسی خوف وخطر کے اس کا صحیح استعمال نہیں کر سکتے؟ اور سیاسی لکچر سُننا کیا ایسا ضروری ہے؟ لکچر کے دوران تم اپنا دھیان بہتر چیزوں کی طرف موڑ سکتے ہو۔''

ادھر سے ایک لانچ تیزی سے گزری۔ اس کے فلڈ لائٹس تیز روشنی پھینکتے جا رہے تھے۔ یہ دریا پر پہرہ دینے والی پولیس تھی۔ یہاں شلنگ اور اوپر بام پُلوں کے درمیان پولیس کی مصروفیت

بہت زیادہ تھی۔ کیونکہ یہاں دریا مشرقی اور مغربی برلن کے درمیان سرحد متعین کرتا تھا۔

''والٹر! تمھارا ذہن، تمھارا وجود اس وقت کہیں اور ہے۔ تم یہاں نہیں ہو۔''

وہ اپنی سانس روکے کھڑا رہا۔ جب تک لانچ کیل پُل کے نیچے نہ چلی گئی۔

''دیوار...... دیوارِ برلن'' اس نے کہا۔ اب اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہر وقت یہ دیوار میرے ذہن کے سامنے رہتی ہے۔ یہ دیوار اور اس کے سامنے موت کا میدان۔ یہ نہ ہوتے تو شاید سب کچھ برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن اب سب کچھ جھیلنے کی ہمت کہاں سے آئے گی؟ پہرے کے میناروں سے، کانٹے دار جالی کی باڑ سے؟''

ایلسے نے کہا۔ ''کسی زمانے میں تم اس سے بالکل مختلف باتیں کرتے تھے۔''

''ہاں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن اس وقت مشرقی برلن بھی زندہ تھا۔ اب اپنے اِردگرد دیکھو۔ جب سے یہ دیوار کھڑی کی گئی ہے، سارے شہر میں موت چھا گئی ہے۔ گلی کوچے مردہ، چوک ویران اور گھر کھنڈر بنے ہیں۔ ہاں، البتہ قبرستانوں میں پودے خوب نشو ونما پا رہے ہیں۔''

''میرا خیال ہے تم غلطی پر ہو، والٹر!'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''تم سارے مشرقی برلن کو اس کی ظاہری صورت میں دیکھ رہے ہو۔ ویران گلیاں، خالی چوک، بمباری سے برباد شدہ مقامات، یہی تمھیں نظر آ رہے ہیں۔ مانا کہ اب تمھیں کوئی اُمید نہیں رہی لیکن تمھیں یاد ہے، تمھیں نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنا رشتہ لوگوں کے ساتھ مضبوطی سے قائم رکھو اور یہ بات میرے دل کو لگی تھی۔''

''دل؟ تمھارے پاس اب بھی دل ہے۔ میرے سینے میں دل کی جگہ ایک پتھر ہے۔ دیوارِ برلن کا ایک پتھر!''

''اگر تم یہ دل کسی اور جگہ لے جاؤ گے تو کیا اس کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا؟ نہیں والٹر، تم جتنی دُور جاؤ گے، دل پر بوجھ اتنا ہی بڑھے گا۔''

''میں جانتا ہوں ایلسے، میں کوئی آرام دہ زندگی گزارنے کے لیے نہیں جا رہا ہوں۔'' میں جانے پر مجبور ہوں۔'' والٹر نے اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے اندر اب بھی

ایک انسان موجود ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ یہ مجھے جانے پر مجبور کر رہا ہے۔''

''اور وہ لوگ جو یہاں رہ گئے ہیں؟'' ایلسے نے بائیسکل پر جھک کر کہا۔ ''وہ کیا کریں گے؟''

''میں کوئی پیغامبر نہیں ہوں کہ سب کی تقدیر کا مجھے علم ہو۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا، یہاں اپنی انسانیت کو قائم رکھنا دُشوار ہو جائے گا۔''

''تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ یہاں لوگ کیا کر رہے ہیں؟'' ایلسے نے جوش میں آ کر کہا۔ ''وہ اپنی زندگی گزار رہے ہیں کہ نہیں؟''

''ہاں، وہ زندگی گزارنے کی سعی تو کر رہے ہیں۔ لیکن کیا وہ اس میں کامیاب ہو رہے ہیں؟''

''تم نے اب بھی ٹھیک نہیں سمجھا۔''

وہ بے چینی سے اپنا سر اِدھر اُدھر پھیر رہی تھی۔ جب اسے نیند نہ آ رہی ہو تو وہ بالکل اسی طرح اپنا سر اِدھر اُدھر پھیرا کرتی تھی۔ والٹر کو پشیمانی کا احساس ہوا۔ اکثر راتوں کو جب وہ دیر سے دبے پاؤں گھر میں داخل ہوتا تو ایلسے یونہی بستر پر پڑی بے چینی سے تکیے پر اِدھر اُدھر سر پٹک رہی ہوتی۔

''جنگ کے فوراً بعد کے زمانے کا تصوّر کرو۔ کیا برلن اس وقت مُردہ نہیں تھا؟ پھر زندگی کہاں سے شروع ہوئی؟ انھیں خرابوں میں سے، چوکوں میں پڑے ہوئے مٹی کے تودوں میں سے؟ زندگی کا آغاز ہم سے ہوا۔ یہ زمانہ ہی ایسا ہے کہ زندگی کی نشوونما ہوتی ہے۔ پھر یہ ختم ہو جاتی ہے۔ میں تم سے اتفاق کرتی ہوں کہ دیوارِ برلن کے سامنے موت کا میدان ایک ایسا گہرا گھاؤ، جیتا جاگتا زخم ہے کہ یہ کبھی نہیں بھر سکے گا۔ لیکن پھر بھی یہ کہنا کہ یہاں موت ہی موت ہے، زیادتی ہے کیونکہ ہم برلن کی زندگی ہیں۔''

''ہم؟'' والٹر نے کہا اور اس کے ہونٹوں کے گوشے مڑ گئے۔ تم ایسی باتیں کر رہی ہو جیسے

یہاں سب ہماری طرح کے لوگ ہیں۔ ہم کا مطلب کیا ہے؟ ایک بے جان اجتماعیت سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی پارٹی کے لوگ بھی ہیں اور وہ بھی جو دیوارِ برلن کے حق میں ہیں۔ یہاں جیتی جاگتی زندگی نہیں ہے۔ بس ایک نظام ہے اور اب یہ دیوار گویا دو ملکوں کو تقسیم کرنے والی سرحد بن گئی ہے۔ اب بس ایک ہی چارہ ہے۔ یہاں سے فرار!''

''لیکن یقیناً برلن سے نہیں۔'' ایلسے نے اپنے شانوں کو ملا۔ وہ سردی محسوس کر رہی تھی۔

''ہاں، میں نے یہی سوچا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''میں سوچتا تھا، یہ مشرقی برلن ہے اور اُدھر وہ دوسرا مغربی برلن ہے۔ لیکن اب معاملہ زیادہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ جب سے دیوارِ برلن کھڑی کی گئی ہے یہاں افراتفری اور سراسیمگی بڑھ گئی ہے۔ حتیٰ کہ اس ہوا میں بھی جس میں ہم سانس لے رہے ہیں خوف و ہراس ہے۔ جو روٹی ہم کھاتے ہیں اس میں سیمنٹ کی دھول ہے۔ وہ گھر جن میں ہم رہتے ہیں ہمارے وجود سے منکر ہیں۔ ان کے پتھر ہمیں حراست میں لیے ہوئے ہیں۔ چوک ہمیں مجرم ثابت کرتے ہیں اور چار دیواریوں نے ہمیں قید میں جکڑ رکھا ہے۔ ہم الگ اور تنہا رہنے کی جتنی بھی کوشش کریں ہر طرف سے بدگمانی شکوک و شبہات میں گھرے ہوئے ہیں۔ اب تم تفریق اور تقسیم کرو اور یہ کہنے کی کوشش کرو کہ وہ لوگ اور ہیں اور اصل برلن یہ ہے۔ نہیں، اب یہ ممکن نہیں، ایلسے!''

''اور مغربی برلن؟'' ایلسے نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''وہاں تم کیا اُمید کر سکتے ہو؟''

''وہاں بھی کچھ نہیں۔'' والٹر نے ڈور کھینچتے ہوئے کہا۔ ''صرف ہوا اور فضا کی تبدیلی ہی میرے لیے کافی ہے تاکہ میں آزادی سے سانس لے سکوں۔''

''اور تم وہاں کرو گے کیا؟''

''جب تک میں مجبور نہ کیا جاؤں، جو چاہے کام کر سکتا ہوں۔ شاید اخبار ہی بیچوں۔ بہرحال دیکھا جائے گا۔'' اب والٹر نے مچھلی پکڑنے کا سامان اور جال اپنی سائیکل سے باندھ لیا تھا۔

ایلسے سردی کے مارے جمی جا رہی تھی۔ اس نے اپنے کوٹ کا کالر اُوپر چڑھا لیا تھا۔

''اور کام سے واپسی پر وہاں کون تمھارا انتظار کرے گا؟''

''کوئی نہیں۔'' اس نے کہا۔''صرف عوامی پولیس یہاں، دیوار برلن کے پاس، ہم جیسوں کا انتظار کرتی ہے۔''

اس کے گلے میں کوئی چیز اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے نگل کر کہا:

''اور کیا تمھیں کوئی ایسا محفوظ راستہ معلوم ہے جہاں سے تم ان کی نظروں سے بچ کر فرار ہوسکتے ہو؟''

''نہیں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ بہر حال ہم یہاں رہ کر بھی کب محفوظ ہیں؟''

ایلسے نے کچھ نہ کہا۔

اب والٹر مچھلی پکڑنے کا سامان پیک کر چکا تھا اور اس نے اپنی پتلون پر بائیسکل کلپ لگائے۔ ہوا کی خنکی اور تیزی محسوس کی۔ یہ خنکی پتہ دیتی تھی کہ اب جلد ہی صبح ہونے والی ہے۔

''مجھے افسوس ہے ایلسے، اب مجھے جانا ہوگا۔ تھوڑا بہت اندھیرا جو رہ گیا ہے اس سے فائدہ اُٹھالوں۔''

''اندھیرا؟'' اس نے کہا۔''ہاں تمھیں اندھیرے سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔'' اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے اعصاب شل ہو رہے تھے۔''عجیب بات ہے، میں تو یہ سمجھتی تھی کہ جدائی صرف اس وقت ہوا کرتی ہے جب ایک دوسرے کے ساتھ نباہ نہ ہوسکے۔''

''ہاں، مجھے بھی کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ ہم یوں جدا ہوسکتے ہیں۔''

اس نے آہستہ سے سائیکل نکالی۔

''یا.....'' اس کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔''یہ کوئی ہماری غلطی تھی، والٹر؟''

''ہماری غلطی؟'' جب وہ ڈائنامو کی بتی جلا رہا تھا تو اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہمت کرو۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ہمت کرو۔

وہ سائیکل پر بیٹھ گیا۔ ڈائنامو کی روشنی ایلسے کے جوتوں پر پڑ رہی تھی، جن پر دھول جمی ہوئی تھی۔ پھر وہ تیزی سے سائیکل چلاتا ہوا دُور نکل گیا۔ اب صرف روشنی کی مخروطی تحریر دُور سے نظر

آ رہی تھی۔اب وہ فریڈرک سٹراز نہر پر پہنچ گیا تھا۔

ہوا اس کی جانب بہہ رہی تھی اور ہوا میں گلی سڑی لکڑی، اور پھولوں کی ملی جلی بُو بسی ہوئی تھی۔سائے سڑک پر سے گزرتے ہوئے اس کے پیچھے اندھیرے میں غائب ہو رہے تھے۔نہر کی ریلنگ تیزی سے اس کے ساتھ ساتھ گزرتی جا رہی تھی اور اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ واقعی فرار ہو رہا ہے۔

تیزی سے فرار ہوتے ہوئے وہ صرف ایک مرتبہ راستہ میں رُکا۔گٹ راؤن پُل پر اسے یاد آیا کہ ایل مچھلی ابھی تک ڈبے میں پڑی ہوئی ہے۔رُک کر اس نے مچھلی نکال لی۔مچھلی کے اندر جینے کا عزم ابھی ٹوٹا نہ تھا۔وہ اس کے ہاتھ میں بُری طرح پھڑک رہی تھی۔

والٹر نے مچھلی پر تین مرتبہ تھوکا اور ریلنگ پر سے نہر میں پھینک دیا۔اندھیرے آسمان کے نیچے مچھلی کا سفید پیٹ جگمگا رہا تھا۔اس کے پنکھ تھرک رہے تھے۔اس نے بغیر کسی آواز کے سطحِ آب کا آئینہ توڑا اور غائب ہو گئی۔

کنڑ کہانیاں

اُگرپا کی اُگادی

(ماستی وِنکٹیش آئینگار)

آج اُگادی، یعنی سال کے پہلے دن کا تہوار تھا۔

پو پھٹنے سے پہلے ہی اُگرپا کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ مویشیوں کے کوٹھے سے آوازیں آرہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا، گائیں بھینسیں ڈر گئی ہیں۔ ایک گائے بار بار پکار رہی تھی۔ اُگرپا بچھونے پر سے اُٹھ بیٹھا اور کوٹھے کے پاس جا کر آواز دی۔ ''ہو، مارا! ہو، مارا! گائیں بھینسیں ڈر کیوں گئی ہیں؟ ذرا دیکھ آ۔ پاس کہیں چیتا دیتا تو دبک کر نہیں بیٹھا ہے؟''

اُس کی پکار کا کوئی جواب نہ ملا۔ شاید مارا وہاں نہیں تھا۔ اُگرپا دروازہ دھکیل کر اندر چلا آیا۔ اور پھر پکارنے لگا۔ ''ہو، مارا!'' مارا وہاں نہیں تھا۔ سب گائیں بھینسیں اپنی اپنی جگہ پڑی ہوئی تھیں، صرف ایک بچھڑا رسّی تڑا کر سراسیمہ، اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ اُس کی ماں بے چین ہو کر چکّر کاٹ رہی تھی، اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر، جہاں تک کھونٹے سے بندھی ہوئی رسّی اسے لے جا سکتی تھی۔ مالک کی آواز سن کر گائے خاموش کھڑی ہوگئی۔ اور بچھڑا بھی اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

اُگرپا نے پھر آواز دی۔ ''مارا، ہو، مارا!''

اِس دوران میں اُگرپا کا بھائی بھی جاگ گیا تھا۔ وہ کوٹھے کے پاس آ کر پوچھنے لگا۔ ''کیا بات ہے بھیا؟'' اُگرپا بولا ''پاس ہی کوئی چیتا ہوگا۔ ذرا دیکھ آؤ۔ پچھلے سال ایک چیتے نے دو گایوں کو مار ڈالا تھا۔ آج سال کے پہلے ہی دن ایسا کوئی حادثہ نہ ہونے پائے۔ یہ نمک حرام مارا کہاں ہے۔؟''

چھوٹے بھائی نے جواب دیا ''مارا کہاں ہے؟ مارا پڑا ہے رنگی کے گھر میں۔ گائیں بھینسیں سب کی سب مر جائیں، اُسے کیا پڑی ہے۔ میں اس کی خبر لوں گا، جان لے گا، نمک

حرام!''

موویشی اپنے بھائی کی نگرانی میں چھوڑ کر اُگرپا گھر کے سامنے کی طرف چلا آیا۔

اب پو پھٹ رہی تھی۔

دھیڑمنیا جو تالاب کا پانی گاؤں کے لوگوں میں بانٹنے پر مامور تھا، اس طرف آتا دکھائی دیا۔ ''سوامی، میں ان لوگوں سے کیسے نباہ کروں گا؟'' آتے ہی اُس نے اپنی رام کہانی شروع کی۔ ''یہ چنپا کی آئے دن کی شرارتیں اور بدمعاشیاں دیکھ کر مجھ سے چُپ نہیں رہا جاتا۔ تین دن پہلے ہی تو آپ نے حکم دیا تھا سوامی کہ ایک دن چنپا کو پانی برتنے دو۔ ایک دن رامپا کو۔ کل شام میں نے بندھ لگا کر چنپا کے کھیتوں میں پانی روک دیا۔ سویرے جو وہاں گیا تو دیکھتا ہوں پانی اب بھی اس آدمی کے کھر نیوں میں بہہ رہا ہے۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ اتنے میں چنپا بھی وہاں آنکلا۔ مجھے دیکھ کر کہتا ہے ''ارے یہ کیا منیا؟ پانی تو نے میرے کھیتوں میں پھیر دیا ہے۔ آج تو میری باری نہیں۔'' اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ مجھے غصہ آگیا۔ ''میں نے پھیرا ہے یا آپ نے؟'' اس پر وہ مجھ سے کہتا ہے ''ارے، تو پانی کو نہ موڑے تو پانی کسی طرف بہے گا بھی!'' اور پھر وہ اپنے کھیتوں سے پانی روک دیتا ہے۔ ''تم بھلے کی ذرا تمیز نہیں، بے ایمان کہیں کا جس کا جی چاہے پانی پھیر لینا اس کے لیے مذاق ہو گیا ہے۔ جس کا جی چاہے پانی پھیر لے تو پھر نہروں کی دیکھ بھال کے لیے میں ہی کیوں رہ گیا ہوں۔ یہی اُونچی ذات والے یہ کام دیکھ لیں۔''

اُگرپا نے منیا کو تسلی دی ''اس کے بارے میں ہم پوچھ گچھ کریں گے۔''

پھر اُگرپا وہاں سے اشنان کرنے کے لیے تالاب کی طرف چل پڑا۔

اُگرپا کے گھر سے تیسرا گھر مریا کا تھا۔ مریا ابھی ابھی گھر سے نکلا تھا۔ اُگرپا اِدھر سے گزرا تو مریا اُسے روک کر باتیں کرنے لگا۔

''اُگرپا ان چیتوں کا کیا کیا جائے؟ میری تجویز ہے کہ پہاڑی پر پھندا لگایا جائے اور ایک بکری باندھ کر چیتے کو پھانسا جائے، ابھی ابھی ایک چیتا ہمارے مویشیوں کے کوٹھے کی طرف آیا تھا۔''

''او، اچھا! تمھارے کوٹھے کے پاس بھی آیا تھا؟'' اُگرپا نے دلچسپی سے پوچھا۔'' ہماری گائیں بھینسیں بھی اچانک ڈر گئی تھیں۔ میں نے دیکھا تو کچھ نہیں تھا۔ لیکن میں تو اسی وقت جان گیا کہ ضرور کوئی چیتا ہوگا۔ اچھا تو سچ مچ چیتا آیا تھا؟''

اُگرپا کو کچھ سوجھتا نہیں تھا کہ ان چیتوں کا کیا کرے۔ ایشور نے اس کے گاؤں کے نزدیک ایک پہاڑی بنادی تھی۔ اس کا کیا کیا جائے۔ پہاڑی ہو، اور اس میں چیتا نہ ہو؟ یہ تو ہو نہیں سکتا۔ ہر دفعہ یہی ہوتا تھا کہ گاؤں کے لوگ ایک چیتا پھانستے، سارے گاؤں میں پھرا کر اُسے مار ڈالتے۔ تین مہینے بھی نہ گزرنے پاتے کہ ایک اور چیتا ان میں موجود ہوتا۔

''ان چیتوں کو مدرنگی کی بھینسوں کا مزا لگ گیا ہے۔'' اُگرپا بولا۔ ''معلوم ہوتا ہے، وہ کسی اور جگہ کے ڈھور ڈنگر اتنی رغبت سے نہیں کھاتے۔''

قریہ مدرنگی، تالاب بہت خوبصورت تھا۔ اس کے ایک طرف ایک بہت بڑا پیپل کا درخت تھا۔ اُگرپا تالاب میں اُتر پڑا اور اشنان کر کے اُوپر آیا۔ پیپل کے درخت کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور عقیدت سے درخت کا طواف کرنے لگا۔ پھر وہ مشرق کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا اور سورج کے طلوع ہونے کا انتظار کرتے ہوئے صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا لُطف اُٹھانے لگا۔ ہوا دائیں جانب سے ہوسلی کے باغوں پر سے ہوتی ہوئی آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ پیپل کے پتے ابھی تازہ اور کومل تھے۔ ہوا کے جھونکوں سے ان میں دھیمی سرسراہٹ پیدا ہوتی۔ لال لال کونپلوں سے تو کوئی آواز ہی نہ نکلتی تھی۔ کونپل تو تھے بچے کی طرح تھی جو محسوس تو کر سکتا ہے پر بول نہیں سکتا۔

تالاب کے بند کے دوسری طرف اپنے اور آم کے گھنے درختوں کا جھنڈ تھا۔ چند درخت پھل لا چکے تھے۔ ہوا اپنے ساتھ اپنے کے پھولوں کی خوشبو لا رہی تھی۔ صرف اس ایک جھنڈ کے پھولوں سے تو اتنی مہک آ نہیں سکتی تھی۔ یہ ضرور ہوسلی کے جھنڈوں سے آرہی ہوگی۔ دُور وہاں ڈھلان میں ہانگنے کے درخت تھے۔ ان کے پتوں میں بیسیوں قسم کے سبز رنگ تھے اور نیچے زمین پر پھول بچھے ہوئے تھے۔

اس طرف تالاب میں پانی بہت کم تھا۔اِدھر کا پانی اس لیے بہت کفایت سے برتنا پڑتا تھا کہ ڈھورڈنگر کے لیے برسات کا موسم آنے تک پینے کے کام آسکے۔

مشرق کی طرف آسمان پر لالی چھاگئی۔سورج اُفق سے آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا۔جیسے ہی سورج کے تھال کا اُوپری حصہ اُفق سے نکلا اُگر پا نے اُٹھ کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ پورا تھال اُبھرنے تک وہ یونہی ہاتھ جوڑے مجسمہ عقیدت بنا کھڑا رہا۔پھر وہاں سے چلا آیا۔

ہریجن مُنیا بھی جو پاس کھڑا انتظار کررہا تھا،اُس کے ساتھ ہولیا۔اُگر پا نے اس سے کہا۔ ’’پانی ذرا دیکھ دِکھا کر برتنا مُنیا!‘‘

’’ہاں۔سوامی میں تو خیال رکھتا ہوں۔ذرا اس چنپّا سے بھی کہیے۔‘‘

چنپّا کا کھیت دُور سے دِکھائی دے رہا تھا۔اُگر پا نے کھیت کی طرف نگاہ دوڑائی۔اس کے سرے پر مقدس چیل بیٹھی ہوئی تھی۔چیل زمین سے اُڑی اور چنپّا کے پانی سے سینچے ہوئے کھیتوں کا چکّر کاٹ کر دوسری طرف جا اُتری۔اُگر پا کو بالکل یہ خیال نہ آیا تھا کہ وہ اس مقدس پرندہ کو آج اتنے سویرے دیکھ سکے گا۔وہ بہت خوش ہوا۔سر جھکا کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور سنسکرت کے وہ اشلوک دُہرائے جو اس نے بچپن میں سیکھے تھے۔’’تیرے سامنے سر جھکاتا ہوں اے پرندوں کے بادشاہ‘‘ وہ چیل کو آسمان پر چکّر کاٹتے دیکھتا رہا۔جب وہ زمین پر اُتر آئی تو وہاں سے چلا آیا۔

راستے میں اُسے گاؤں کا شاستری ملا۔اور آتے ہی کہنے لگا۔’’تالاب کا بند دیکھ رہے ہو اُگر پا؟ ابھی کام ختم ہی نہیں ہوا۔ ہمارا گاؤں پھر بھی خوش نصیب ہے کہ یہاں کام آسانی سے انجام پا جاتے ہیں۔مدوارا میں جا کے دیکھو تو پتہ چلے وہاں ایسے کاموں کے لیے کتنی دُشواری ہوتی ہے۔گاؤں کے لوگ ہیں کہ کام کرنے پر رضامند ہی نہیں ہوتے۔سرکار اپنی طرف سے کام کرادیتی ہے اور گاؤں والوں سے خرچ وصول کرلیتی ہے۔‘‘

’’ہمارا گاؤں غریب ہے۔‘‘ اُگر پا بولا۔’’ہم تو معمولی لگان بھی ادا نہیں کرسکتے۔اب جرمانے الگ کہاں سے دیں؟ مدوارا کے لوگ کافی پیسے والے ہیں۔اگر ہمارے گاؤں میں بھی

ایسا ہونے لگے تو ہم گاؤں والے جئیں گے کیسے؟''

شاستری اور اُگر پا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے چلتے رہے۔

پھر شاستری نے کہا ''بیٹی کو اس کے پتی کے گھر بھیج رہا ہوں۔ سُنا ہے اس کی ساس بیمار ہے۔ وہ خود ہی آ کر اپنی بیوی کو ساتھ لے جا سکتا تھا، پر وہ آیا نہیں۔ لڑکی آپ ہی کہہ رہی ہے مجھے جلدی جانا چاہیے نہیں تو وہ خفا ہو جائیں گے۔''

''ہاں لڑکی کو یہی کہنا چاہیے، اسے بھیجنے میں آپ کو کیا عذر ہے؟''

شاستری نے جواب دیا۔ ''مجھے کوئی عذر نہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے قریہ کی چاروں گاڑیاں ہر روز کوئی نہ کوئی کرایہ پر لے جاتا ہے۔ کوئی گاڑی صرف میرے لیے باندھی جائے تو بیچارے گاڑی بان کا نقصان ہوگا۔ کرایہ کے پیسے نہ مِل سکیں گے اور میں اکیلا اتنے پیسے تو نہیں دے سکتا کہ اس کے نقصان کی تلافی ہو سکے اور بچّی اُمید سے ہے۔ میں نے اُسے سمجھایا کچھ دیر اور انتظار کرے تو میں آپ سے خچر مانگ لاؤں گا۔ آپ کا خچر مل سکے تو میں اپنی بیٹی کو اُس کے پتی کے گھر بھیج سکوں گا۔''

''اوہ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ آپ جب چاہیں میرا خچر لے جائیں۔ مدرنگی کی ایک بیٹی، اپنے پتی کے گھر جا رہی ہو تو ایسے نیک کام کے لیے میرا خچر ہر دم تیار ہے، خچر کے بغیر دو ایک دن میں کیسے بھی کام چلا لوں گا۔''

''آپ کی بڑی مہربانی ہے۔'' شاستری نے کہا۔ ''آپ گاؤں کے پٹیل ہیں۔ آپ کی نگرانی میں ہم گاؤں والے کتنے خوش حال ہیں۔ ہم سب کو آپ پر بھروسہ ہے کہ وقت پر آپ ہماری مدد کریں گے۔''

اُگر پا نے ہنس کر جواب دیا۔ ''مگر اپنے کیے کی جزا تو مجھے مل رہی ہے، میرے لیے یہی کیا کم ہے کہ لوگ مجھے اچھا کہتے ہیں اگر اُگر پا اپنا خچر دینے سے انکار کر دے تو اُگر پا میں اور ہر دوسرے آدمی میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ پھر میرا خچر کبھی نہ کبھی تمھارے باغ میں گھس آیا ہوگا۔ اب اس سفر میں شاردماں کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر وہ اس غلطی کی تلافی کر لے گا، کیوں؟''

رام شاستری ہنس پڑا اور رخصت لے کر وہاں سے چلا گیا۔

اُگرپا کچھ دیر تالاب کے بڑے باغ میں اور چراگاہوں میں ٹہلتا رہا۔ پھر مڑ کر گاؤں کی طرف ہولیا۔ اُسے یاد آیا کہ اس کی بیوی نے رات کہا تھا چونکہ آج سال کا پہلا دن ہے۔ ضرور تیل مل کر نہانا چاہیے۔ آج صبح مویشیوں کے کوٹھے میں گڑبڑ نہ ہوتی تو وہ کچھ دیر اور بستر پر پڑا رہتا۔ اپنے معمول کے وقت پر اُٹھتا اور اُٹھ کر سب سے پہلے اشنان کرتا۔ مگر چیتے نے اس کا سارا کارکرم اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس لیے وہ تیز تیز قدم بڑھائے چلا جا رہا تھا تاکہ جلد سے جلد گھر پہنچ کر اشنان کرے۔

جوں ہی وہ گاؤں کے گیٹ پر پہنچا، اسے ایک وردی پوش ملازم ملا۔

''کیوں مُکپا، آج چھٹی کے دن کیسے آنا ہوا؟'' اُگرپا نے اُس سے پوچھا۔

چپراسی نے کہا ''شیخ دار نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے، سوامی۔ اس دفعہ اُگادی کے دن گُڑ بانٹنے کے لیے گروسندرا کے مُکھیا نے عملدار کو گُڑ مہیا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ گاؤں والوں سے گُڑ لے کر شان بھوگ کے ہاں جمع کیا گیا تھا۔ ان دنوں شان بھوگ کے ہاں کوئی بیاہ رچا تو بھولے سے اس میں سے آدھا گُڑ استعمال کر لیا گیا۔ اب شان بھوگ نے کوشش کر کے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے بہت سا گُڑ آپ ہی مہیا کیا ہے مگر دس بھیلیاں گُڑ اور چاہیے۔ شیخ دار نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ یہاں سے گُڑ لیتا آؤں۔''

''سُنو مُکپا'' اُگرپا نے جواب دیا۔ ''ہمارا گاؤں چھوٹا، موٹا قریہ ہے۔ خود ہماری باری آنے پر گُڑ مہیا کرنا مشکل ہے۔ دوسروں کی کمی پورا کرنے کے لیے ہمارے پاس گُڑ کہاں ہے؟''

پھر اُگرپا کچھ دیر بعد بولا۔ ''اچھا، تو دس ہی بھیلیا کافی ہیں یا شیخ دار کے لیے بھی کچھ چاہئیں۔''

''یہ تو آپ بہتر جانتے ہیں سوامی۔''

''اچھا''

اُگرپا گاؤں میں داخل ہوا اور گاؤں کے بڑے ہال میں پہنچ کے اپنی جگہ سنبھال لی۔ اُس نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک آدمی کو پکار کر کہا کہ گاؤں کے چار آدمیوں کو بُلا لائے۔ تعلق آفس کا چپراسی چاوڑی (گاؤں کا بڑا ہال) کے ایک کونے میں جا بیٹھا۔ اتنے میں رامپا اور چنّپا

وہاں لڑتے جھگڑتے آ پہنچے۔ راماپا چنپا سے کہہ رہا تھا۔ ''دیکھو ہمارا مُکھیا یہاں موجود ہے۔ اس کے سامنے سب کچھ کہہ دیں گے، وہ ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرے گا۔''

اس دوران میں رام شاستری اور پنڈت رام بھٹیا بھی آ گئے۔ اور وہ چار آدمی جو بُلائے گئے تھے، یکے بعد دیگرے آنے لگے۔ راماپا اور چنپا نے اپنے جھگڑے کا فیصلہ کرانا چاہا، لیکن اُگر پا نے کہا ''ذرا ٹھہرو، ابھی فیصلہ کیے دیتا ہوں۔'' پھر وہ ان چار آدمیوں سے مخاطب ہوا۔ ''عملدار کے لیے گُڑ کی دس بھیلیوں کی ضرورت ہے۔ شیخ دار کے لیے دو میں اور چاروں میں سے ہر ایک اپنے گھر سے گُڑ کی تین تین بھیلیاں لیتا آئے۔''

اُنھوں نے یہ بات آسانی سے منظور نہ کی۔ ''جب ہماری باری آئی تو ہم گُڑ دے چکے۔ اب پھر کیوں ہم پر زیادتی کی جارہی ہے؟''

اُنھیں بُڑبُڑاتے دیکھ کر اُگر پا بولا۔ ''اچھا، آپ لوگ صرف دو دو بھیلیاں لائیں۔ بقیہ چار میں خود ہی دے دوں گا۔'' پھر اُس نے مُنکپا کو اپنے گھر بھیجا کہ چار بھیلیاں گُڑ مانگ لائے۔

اس پر راما شاستری نے کہا۔ ''آپ تو مانگتے ہی دے دیتے ہیں۔ اسی لیے تو یہ لوگ ہمیشہ مانگتے ہی رہتے ہیں۔''

پنڈت نے کہا ''ہمارے مُکھیا افسروں سے سلوک کرنا جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افسر ہمارے گاؤں کی خاص طور پر اچھی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ عملدار کے ماتحت تین سو گاؤں ہیں۔ پھر بھی دیکھیے، اس سال صرف مدرنگی میں انھوں نے کنواں بنوایا۔ اگر کنواں بنوانے کا بار ہم پر پڑتا تو کیا ہم دس بھیلی گُڑ میں کنواں بنوا لیتے؟''

''کنواں بنانے میں عملدار اپنی جیب سے تھوڑے ہی خرچ کرتا ہے۔'' راما شاستری اُلجھ پڑا۔ ''کنواں وہ سرکار کے روپوں سے بنوائے، اور گُڑ اپنے ذاتی استعمال کے لیے ہم سے لے؟''

اُگر پا نے کہا۔ ''لیکن کیا سرکاری روپیہ کنواں بنانے کے لیے آپ ہی آپ ہمارے گاؤں چلا آتا ہے؟ بادل پانی سے بھرپور اُوپر اُٹھتا ہے تو اُسی جگہ جاتا ہے جہاں ہوا اُسے لے جاتی ہے اور وہیں برستا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہوا کا رُخ اپنی طرف پھیر لیں۔ افسروں کی نظرِ عنایت ہم پر

ہے۔ میں بیوقوف ہوں جو تھوڑے سے گُڑ کے لیے اسے کھولوں؟''

پھر اُگر پا چنپا کی طرف متوجہ ہوا۔ ''کیوں چنپا، تم نے وعدہ کیوں توڑا، اسی چاوڑی میں تمھارا فیصلہ ہوا تھا اور تم اس فیصلے پر قائم نہ رہے۔''

پہلے تو چنپا نے یہ ظاہر کیا کہ وہ بے قصور ہے، مُنیا نے بھولے سے اِس کے کھیتوں میں پانی نہ روکا ہوگا۔ مُنیا کے انکار پر چنپا نے کہا۔ شاید بندھ ٹوٹ گیا ہو۔ مُنیا نے پھر احتجاج کیا کہ یہ ہرگز ہو نہیں سکتا۔ بندھ اس نے بہت مضبوط بنایا تھا۔''

پھر چنپا نے مان لیا کہ شاید اُس کے نوکر نے بندھ توڑ دیا ہو۔ اُسے مُکھیا کے حکم کی کیا خبر؟ اُگر پا کو چنپا کی یہ بڑائی پسند نہ آئی۔ ''بہت اُونچی مت ہانکو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ اگر اِس چاوڑی میں قرار پائی ہوئی بات یوں توڑ دی جائے تو یہ چاوڑی ہے کس لیے؟''

''چاوڑی ہے کس لیے؟ کسانوں کو تباہ کرنے کے لیے؟''

''کیا کہہ رہے ہو چنپا؟''

''ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔ یہ تمھاری کیسی سرداری ہے؟ میری تین ایکڑ زمین ہے اور رامپا کی صرف دو ایکڑ زمین۔ یہ کیسا انصاف ہے کہ دونوں کو ایک ایک دن پانی برتنے دیا جائے۔ مکھیا رامپا کی طرفداری کرتا ہے۔ رامپا اُگر پا کا رشتہ دار جو ہوا۔ مُکھیا کہلا کر عزّت حاصل کرنا آسان ہے۔ مُکھیا گری کرنا آسان نہیں۔''

اُگر پا نے ان سب باتوں کے جواب میں صرف ایک سوال پوچھا۔ ''تو میری جگہ تم مُکھیا بنو گے چنپا؟''

''میں کب کہتا ہوں؟''

''تو پھر میرے مُکھیا بننے پر تمھیں اعتراض کیوں ہے؟ چند دن ہوئے خود تم نے دس آدمیوں کے سامنے یہ فیصلہ منظور کیا تھا۔ اب یہ کہتے ہو کہ یہ بے انصافی ہے۔ اگر میں مُکھیا بننے کے قابل نہیں تو آؤ تم یہ کام سنبھال لو۔''

گاؤں کا شان بھوگ بھی وہاں آ پہنچا تھا، اور یہ باتیں سُن رہا تھا۔ چنپا کو ایک طرف لے

جا کر اُس نے آہستہ سے سمجھایا اور اس سے اپنی غلطی منوالی۔ پھر شان بھوگ نے یہ فیصلہ کیا کہ مُکھیا سے گستاخانہ گفتگو کرنے کے جرمانے میں چنپا چار بھیلیاں گُڑ کی لادے۔

اُگر پا نے یہ بات منظور نہ کی۔ ''عملدار یہ گُڑ غریبوں اور برہمنوں میں بانٹ رہے ہیں۔ اس میں میں بھی تھوڑا گُڑ دوں تو مجھے بھی ثواب ملے گا۔ میں اپنا ثواب کیوں گنواؤں؟ اب اشنان کر کے میں خود ہی اپنے گھر گُڑ بانٹ رہا ہوں۔''

کچھ دیر یونہی بحث رہی۔ پھر یہ طے پایا کہ اب نو دن بعد زانا نومی کا تہوار آئے گا اور اس میں شربت جو بنے گا اس کے لیے چنپا گُڑ مہیا کرے۔ اتنے میں گاؤں کے لوگ گُڑ لے آئے۔ اُگر پا نے شیخ دار کے نوکر کو بُلا کر اُس کے سامنے گُڑ کی بھیلیاں گنیں اور گاؤں کے دو چھوکروں کے ہاتھ دے کر کہا کہ پہنچا آئیں۔ پھر اُس نے مُکھیا سے کہا شیخ دار کے لیے جو دو بھیلیاں دی گئی ہیں اُن میں سے چھوٹی وہ اپنے لیے رکھ لے۔

''میں مانگنا چاہتا تھا سوامی۔ آپ نے مجھ غریب کو دھیان میں رکھا، آپ کی مہربانی ہے سوامی۔''

مُکھیا گُڑ لے کر چلا گیا تو شاستری نے کہا۔ ''کون جانے اس میں سے کتنا گُڑ عملدار تک پہنچے گا۔''

پنڈت نے کہا۔ ''شہد نکالنے والا اپنی اُنگلیاں ضرور چاٹ لے گا۔ اس میں سے یہ نوکر تھوڑا گُڑ اُڑا لے گا، کچھ شیخ دار لے لے گا اور جو کچھ بچے گا وہ عملدار تک پہنچے گا۔''

ساشتری بولا۔ ''کچھ بھی ہو اُگر پا تو عملدار سے پوچھنے سے رہے کہ اُنھیں گُڑ ملا کہ نہیں۔''

پنڈت بولا۔ ''اچھا، بس اتنی ہی ہے تمھاری سمجھ بوجھ؟ اُگر پا اتنے نادان نہیں ہیں۔ وہ عملدار سے کہیں گے، اب کے میں اتنا اچھا گُڑ بھیج نہ سکا کیوں کہ پہلے سے مجھے خبر نہ تھی اگلی دفعہ اس سے اچھا گُڑ بھیجوں گا، اور یوں پتہ چل جائے گا کہ عملدار کو گُڑ ملا کہ نہیں۔''

اُگر پا یہ سُن کر مسکرایا۔

اتنے میں اُگر پا کے گھر سے بچے بھاگے بھاگے آئے۔ ''امّاں کہتی ہیں نہانے کے لیے

پانی تیار ہے۔"

اُگرپا نے مڑکر پنڈت سے پوچھا۔ "دال، گُڑ آپ کو مل چکا؟"

پنڈت نے جواب دیا۔ "گھر پہنچا دیا ہوگا، میں نے دیکھا نہیں۔"

اُگرپا نے اپنے بچّوں سے کہا۔ "دوڑ کر گھر جاؤ اور پوچھ آؤ کہ پنڈت کے گھر دال گُڑ پہنچا دیا گیا ہے یا نہیں؟ یہاں آ کر مجھے بتانا، سمجھے؟" بچّے دوڑ کر ماں سے پوچھ آئے اور اُگرپا کو بتایا کہ پنڈت کے گھر دال گُڑ کبھی کا بھیجا جا چکا ہے۔

پھر شان بھوگ نے لگان کی وصولی کا سوال پیش کیا۔ دو قسطیں اَدا کر دی گئی تھیں۔ اب تیسری قسط باقی تھی۔ پانچ کسانوں نے ابھی تک لگان اَدا نہیں کیا تھا۔ اگر سرکار کو وقت پر محصول اَدا کرنا ہو تو اس کے لیے ابھی سے کوشش ضروری تھی۔

مُکھیا اُگرپا نے ان لوگوں کے نام پوچھے جنھوں نے ابھی تک لگان اَدا نہیں کیا تھا۔ اور مُتیا کو بھیجا کہ انھیں بُلا لائے۔ اُن میں سے آٹھ آدمی آ گئے۔ شان بھوگ نے انھیں بتایا کہ ان کے ذمہ کتنا روپیہ باقی ہے اور انھیں یقین دلایا کہ حساب بالکل درست ہے۔ حساب کرتے کرتے دوپہر ہو گئی۔ جب حساب ہو چکا تو شان بھوگ نے ان سب کو مخاطب کیا۔

"سنو۔ ہمارے مُکھیا کو یہ منظور نہ تھا کہ تہوار کے دن تمھیں تکلیف دی جائے، لیکن معاملہ بہت اہم تھا، اس لیے تمھیں تکلیف دی گئی۔ تم سب کے ذمہ جو رقم ہے وہ اَدا نہیں کی گئی تو تعلق آفس سے نوٹس آ جائے گا۔"

ان میں سے ایک نے کہا۔ "نہ بھیّا یہ تو تمھارا فرض ہے۔ چھٹّی کے دن تم ہمیں تکلیف نہ دو تو سرکار تم سے پوچھے گی۔ کچھ بھی ہو نوٹس نہ آئے۔ یہ تو بڑی شرم کی بات ہوگی۔"

اُگرپا بولا۔ "کیا ہمارا گاؤں مدرنگی مداوارا ہوا کہ بقایا کے لیے نوٹس آئے؟ اگر ٹیکس کے لیے سرکار کی طرف سے ایک بھی نوٹس آئے تو میں اسی وقت مُکھیا گری سے الگ ہو جاؤں گا۔"

آخر چاوڑی کی محفل برخاست ہوئی۔

اُگرپا کو اب گھر جا کر نہانا تھا۔ اس کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی اُس کی بیوی نے سُن رکھا

تھا کہ چاوڑی میں چنپا نے اُس کے پتی کے سامنے گستاخانہ گفتگو کی تھی اور اُگر پا نے اُس کی گستاخ باتوں کے بہت ہی نرم جواب دیے تھے۔ جیسے ہی اُگر پا نے گھر میں قدم رکھا اُس کی بیوی برس پڑی ''کیا تمھیں تہوار کی رسموں کا بھی دھیان نہیں؟ سارا گاؤں تہوار منا رہا ہے۔ تمھیں اتنی بھی سمجھ نہیں کہ جانے سے پہلے تیل ہی مل کر نہالو۔ سال بھر کی مُکھیا گری آج ایک ہی دن میں ختم کرنی تھی؟ بچّوں نے کھانا بھی نہیں کھایا، تمھارا انتظار کرتے رہے گھڑی دوپہر ہے، سورج سر پہ آپہنچا ہے اور تم ہو کہ اب چلے آرہے ہو!''

''میں کر بھی کیا سکتا تھا؟ منھ اندھیرے ہی چنپا آدھمکا۔ پھر مُنیا چنپا کی شکایت لیے آموجود ہوا۔ پھر اِدھر سے گُڑ کے لیے شیخ دار کا نوکر آگیا۔ پھر اس کے بعد شان بھوگ شکایت لیے آن پہنچا کہ لگان کی وصولی برابر نہیں ہو رہی ہے اور یوں باتوں باتوں میں دوپہر ہوگئی۔''

اُگر پا کی بیوی بولی۔ ''اور میں یہ کیا سُن رہی ہوں؟ چنپا نے تمھیں جی بھر کر گالیاں دیں اور تم چُپ سادھے بیٹھے رہے۔ تو ہر کوئی مُکھیا کو بُرا بھلا کہہ سکتا ہے؟''

''چنپا نے بُرا بھلا کہا ضرور، لیکن اب اس کے بدلے میں راما نومی کے تہوار پر شربت جو بٹے گا، چنپا کا بٹے گا۔''

تو نوبت یہاں تک آئی ہے، جو کوئی ایک دن کا شربت پلا دے وہ تمھاری مُکھیا گری کو بُرا بھلا کہہ سکتا ہے؟ واہ، واہ ہمارے مُکھیا کا کیا رُعب ہے، کیا شان ہے۔''

''تہوار کے موقعہ پر مجھے گالیوں سے نہلاؤ گی؟ یا تیل مل کر پانی بھی ڈالوگی؟''

اُگر پا کی بیوی اس کے بیٹھنے کے لیے ایک تختہ اُٹھا لائی۔ تیل اور ہلدی بھی اس کے پاس لا رکھی۔ پھر دو تین اور ضرورت کی چیزیں اندر سے لے آئی۔ اُگر پا تختہ پر بیٹھ گیا اور اُس کی بیوی نے اُگادی کے اشنان کی ساری رسمیں ادا کیں۔ پھر بولی۔ ''تم گِلہ کرتے ہو کہ میں تمھیں گالیوں میں نہلا رہی ہوں۔ چنپا جو تمہارا کچھ نہیں لگتا، تہوار کے دن تمھیں گالیاں دے سکتا ہے اور میں تمھاری بیوی، کیا دو لفظ منھ سے نہیں نکال سکتی؟''

اُگر پا نے جواب دیا۔ ''اگر ایک آدمی غصہ میں اپنے ہوش کھو بیٹھے اور مجھے بُرا بھلا کہے

تو میں کیا کرسکتا ہوں؟ تم ہی کہو، ایسے میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟"

"میں کہوں؟ میں کہوں۔ میں ہوتی تو اسے خوب مزہ چکھاتی۔ کون ہوتا ہے وہ مُکھیا کو بُرا بھلا کہنے والا؟ اُس کے منہ پر تڑاق سے ایک تھپڑ مارا ہوتا!"

"بچّہ مجھے مارے تو کیا مجھے بھی اُسے مارنا چاہیے؟ بچّہ کی مار تو میں سہہ سکتا ہوں، بھلا بچّہ میری مار کیسے سہہ سکے گا۔ کسان کے غصہ سے مُکھیا کا کچھ نہیں بگڑتا لیکن مُکھیا کو غصہ آجائے تو بیچارے کسان پر کیا گزرے گی؟ آج تہوار کا دن ہے، اسے معاف ہی کر دینا چاہیے۔"

پھر اُگادی کا اشنان اور مورتی کی پوجا۔ لوبان جلایا گیا۔ پوجا کی گئی۔ چھ گھر میں گڑ بانٹا گیا ہے۔ پھر پرشاد کے طور پر وہ گُڑ بٹا جو پجاری نے نیم کے کومل پتوں میں مورتی کے سامنے رکھا تھا۔

آخر کار اُگرپا نے بچّوں کے ساتھ کھانا کھایا اور کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ گاؤں کے چوکیدار نے آکر خبر دی۔ ڈھور ڈنگر چراگاہ میں چر رہے تھے کہ چیتے نے ان پر حملہ کر دیا۔ گڈریا رنگا نے اپنی لاٹھی سے چیتے کو مار ڈالا۔ اب مرے ہوئے چیتے کا جسم چاوڑی کے سامنے لایا گیا ہے اور مُکھیا کو وہاں ضرور پہنچنا چاہیے۔

اُگرپا کے وہاں پہنچنے تک سارا گاؤں چاوڑی کے سامنے جمع ہو گیا تھا۔ لوگ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے، کیونکہ سال کے پہلے دن چیتا مارا گیا تھا۔ "جب یہ سُنا کہ سب سے پہلے ہمارے مُکھیا نے چیتا دیکھا تو میں تبھی جان گیا کہ چیتا اب بچے گا نہیں۔" لوگ کہہ رہے تھے کسی کو اس بات کا خیال نہ رہا کہ مُکھیا نے نہیں بلکہ مریا نے سب سے پہلے چیتا دیکھا تھا۔ بلکہ مُکھیا نے تو چیتے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی نہ تھا۔ صرف گائے اور بچھڑے کی خوف زدہ پُکار سُنی تھی۔ پل اپا نے جو قصّے گھڑنے میں ماہر تھا، فوراً ہی اس کا بھی ایک قصّہ گھڑ لیا کہ جب اُگرپا مویشیوں کے لیے کوٹھے میں گیا تو چیتا دیوار پر بیٹھا تھا، اُس کی آنکھیں دو انگاروں کے مانند دہک رہی تھیں اور مُکھیا کو دیکھتے ہی چیتا کود کر بھاگ گیا۔

"چیتے کی آنکھوں کو ذرا دیکھو ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

''مرے ہوئے چیتے کی آنکھوں کو کیا دیکھیں؟''

اس دوران سب لوگوں نے مل کر رنگا کو سنوارا تھا۔ اسے چاوڑی کے سامنے ایک اونچی جگہ پر فاتح کے انداز میں بٹھایا گیا تھا اور چیتے کا مردہ جسم اس کے پاؤں میں رکھا گیا تھا۔ جب اُگرپا آیا تو سب نے ہٹ کر اس کے لیے جگہ بنا دی۔ چیتے کو مارنے سے رنگا کو جتنی عزت ملی، اتنی عزت مُکھیا کو صرف دیکھنے سے مل گئی۔ مُکھیا کی اجازت لے کر لوگوں نے چیتے کے جسم کو سنوارا اور رنگا کو پھولوں کے ہار پہنا کر جلوس نکالا۔ یہ فیصلہ ہوا کہ یہ جلوس پاس کے دو اور دیہاتوں میں لے جایا جائے۔ پھر انعام کے لیے، چیتے کا جسم تعلق آفس پہنچایا جائے۔

اُگرپا بھی جلوس کے ساتھ ساتھ رہا لیکن جلوس کے دوسرے گاؤں جانے سے پہلے گھر لوٹ آیا۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ جوانی میں وہ دُبلا پتلا، پھُرتیلا تھا۔ کبھی اس نے بھی چیتا مارا تھا اور اس کا بھی جلوس نکالا گیا تھا۔ ان دنوں اس کا سب سے بڑا بیٹا صرف دو برس کا تھا۔ اب تو وہ سولہ برس کا تھا۔ اور اُگرپا ادھیڑ ہو چلا تھا۔ اس کی توند آئے دن بڑھتی جا رہی تھی۔ بھاری بھرکم جسم کا بوجھ لادے جلوس کے ساتھ ساتھ دھوپ میں پھرتے پھرتے اس کا دم نکلا جا رہا تھا۔ وہ مردہ چیتا ہی بھلا کہ کڑی دھوپ کی گرمی اُسے ذرا بھی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ سوچتے، اُگرپا گھر پلٹ آیا۔

گھر آتے ہی ماں گلہ کرنے لگی۔ ''بیٹا یہ کیا، تم تو تہوار کے دن بھی چاوڑی میں جا بیٹھتے ہو۔ پھر ایک چیتا مرتا ہے تو جلوس نکالنے دھوپ میں پھرا کرتے ہو۔ تمھاری جگہ تمھارے بیٹے کو بھیج دیا ہوتا۔''

اُگرپا نے جواب دیا۔ ''اماں تمھارا بیٹا دھوپ میں جائے تو تم بُرا مانتی ہو۔ میرے بجائے لڑکے کو بھیجوں تو تمھاری بہو بُرا مانے گی، اور مجھے گالیاں دے گی۔''

پھر اُگرپا جا کر لیٹ آیا۔ چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ راما بھٹا آن موجود ہوا۔ اُگرپا کو پھر اُٹھنا پڑا۔ پجاری کے لیے تختہ بچھا کر وہ اُس کے ساتھ آ بیٹھا۔

پجاری راما بھٹا نے کہا۔ ''اُگرپا بہت تھکے ماندے معلوم ہوتے ہو۔'' اُگرپا واقعی بہت تھکا ہوا تھا، لیکن وہ بتانا نہ چاہتا تھا۔

"نہیں، ایسا کچھ تھکا تو نہیں، کہیے کیسے آنا ہوا؟"

لیکن یہ دیکھ کر کہ اُگرپا بہت زیادہ تھکا ہوا ہے، پجاری کو ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اپنے آنے کا اصل مقصد بتائے۔ اس کی بجائے اُس نے کو چیلا کی کہانی سُنانی شروع کی۔ جیسے ہی کہانی شروع ہوئی سارے بچے بھاگے بھاگے آئے اور پجاری کے گرد جمع ہو گئے۔ اُگرپا کی بیوی اور گھر کی دوسری عورتیں بھی کچھ دُور پر آ بیٹھیں۔ یہ کہانی کوئی نئی کہانی نہ تھی۔ اگر نئی تھی تو صرف بچّوں کے لیے نئی تھی۔ پھر بھی لوگ بار بار یہ کہانی سُننے کے شوقین تھے۔ کیونکہ کرشنا سدا جوان ہے اور اس کی کہانی سدا نئی اور تازہ۔ پجاری بڑی تفصیلوں کے ساتھ کہانی سُنا رہا تھا کہ اتنے میں گاؤں کے مندر کا آرچک آ گیا۔ اُس روز شام، دستور کے مطابق مدرنگی کے مندر میں مُکھیا کے گھر والوں کی پوجا تھی۔ آرچک کو پوجا کے لیے چیزیں دی گئیں۔ اُگرپا کی بیوی بڑی ہوشیار اور کفایت شعار عورت تھی۔ اس کے ہاتھ سے زیادہ چیزیں نکالنا آسان نہ تھا، اس لیے آرچک نے اُگرپا کی موجودگی میں سب چیزیں لے لیں۔

اُس وقت سورج پچھّم میں اُتر رہا تھا۔ اُگرپا کچھ دیر سو رہنا چاہتا تھا، لیکن اس کی ماں بولی "تہوار کے دن شام کو سونا اچھا نہیں۔" وہ ذرا آرام لینا چاہتا تھا لیکن اُسے موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس لیے وہ پھر چاوڑی چلا گیا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے جو چیتے کے جلوس کے ساتھ جا نہ سکے تھے، چاوڑی میں آ بیٹھے اور اُگرپا کے ساتھ بیٹھے باتیں کرنے لگے۔

یونہی شام ہو گئی۔ گڈریے مویشیوں کے گلّوں کو گاؤں میں ہنکائے لیے آ رہے تھے اور اُن کی بانسریوں کی میٹھی مدھر تانیں فضا میں گونج رہی تھیں۔

ایک بوڑھا بولا۔ "بھگوان کی کرپا سے آج ہم بچ گئے۔ سال کے پہلے دن ہی کوئی گائے بھینس ماری جاتی تو کیا ہوتا۔ یہ سب ہمارے مُکھیا کی برکت سے ہے۔"

اُگرپا جانتا تھا کہ یہ سب لوگ یونہی محبت سے کہتے ہیں۔ ورنہ خیر و برکت میں اس کا کیا دخل؟ لیکن اُگرپا کو اس سے دلی مسرت حاصل ہوتی تھی کہ گاؤں کے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں۔

سورج غروب ہونے کے بعد اُگرپا اور چند بوڑھے تالاب پر گئے۔ نہائے اور وہاں سے واپس گاؤں کے مندر میں آئے۔ مندر میں پوجا اور بھجن وغیرہ کے ختم ہونے تک رات ہوگئی۔ چونکہ گاؤں کے سب نوجوان چیتے کے جلوس کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ ان کے آنے تک انتظار کرنا پڑا۔ اس لیے کہ یہ مُکھیا کی خاص پوجا تھی اور اگر کوئی اس میں شریک ہونے سے رہ جاتا تو وہ اس کا بُرا مانتا۔ ''کیا میں اتنا گیا گزرا ہوں کہ مُکھیا کی پوجا میں بُلایا نہ جاؤں؟'' پوجا پاٹ اور پرشاد بانٹنے میں بہت دیر ہوگئی اور سب لوگ رات گئے گھر پہنچے۔

مندر سے واپس آنے کے بعد پھر سب لوگ جنتری سُننے کے لیے چاوڑی میں جمع ہوئے۔ سال کی جنتری بڑی تفصیل سے سُنائی جاتی تھی۔ آکاش کس دن کیسا نظر آئے گا۔ بُرج کہاں کہاں ہوں گے۔ بارش کب ہوگی۔ فصلیں کیسی ہوں گی۔ پھر ہر کسان کو الگ الگ یہ بتایا جاتا کہ یہ سال اس پر کیسا گزرے گا۔ جنتری کے ختم ہوتے ہوتے سارے بچے تو جہاں بیٹھے تھے وہیں سوگئے۔ بڑوں کا بھی جمائیوں سے بُرا حال ہورہا تھا۔

آخرکار مُکھیا اُگرپا گھر چلنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پجاری بھی اُس کے ساتھ ہولیا۔ اُگرپا نے اُس سے پوچھا۔ ''آج آپ کچھ کہنا چاہتے تھے۔''

رام بھٹا بولا۔ ''ہاں اُگرپا، میں تو آج دوپہر ہی یہ بات پوچھنا چاہتا تھا، لیکن سوچا تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ ایک دو دن بعد کہوں۔ لیکن میری بیوی کہتی ہے، آج کا دن اچھا ہے۔ آج ہی پوچھ لو۔ ہمارے مُکھیا نے آج گُڑ کا دان دیا ہے تو براہمنی کا بھی دان دے۔ اور میں آج ہی پوچھنے آیا ہوں کیونکہ آج کا دن مبارک دن ہے۔''

پجاری کا مطلب اپنے بیٹے کی براہمنی یعنی زنار باندھنے کی رسم تھا۔ اِس رسم پر بہت خرچ آتا تھا۔ اس لیے پجاری مُکھیا سے کچھ مدد مانگ رہا تھا۔

اُگرپا نے کہا ''ہاں کیوں نہیں؟ ہم اسی سال میں یہ رسم کردیں گے۔ تمھارے لڑکے کی کیا عمر ہے؟''

پجاری نے جواب دیا۔ ''اب دس برس کا ہوگیا ہے۔ پچھلے سال ہی رسم ادا کرنی تھی لیکن

فصلیں اچھی نہیں تھیں اور میں تمھیں تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ اب کے بھی یہ رسم نہ ہوئی، تو مجھے ڈر ہے کچھ ہو نہ جائے۔ لڑکا بڑا ہو گیا ہے۔ اگر وہ برہمن کے فرائض بجا نہ لا سکے تو کم از کم ہر روز گیاتری تو پڑھ سکتا ہے۔ یہ بھی نہ کرے تو اس کے برہمن ہونے کا فائدہ ہی کیا؟''

''ٹھیک بات ہے بالکل ٹھیک'' اُگرپا نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ''اگر لڑکے کو کوئی نقصان نہ پہنچے تب بھی یہ اچھی بات نہیں کہ براہمن کا بچہ دھاگا باندھے بغیر پھرا کرے۔ اسی سال یہ رسم کر دو۔ لوگ اس کے لیے چندہ دے دیں گے۔'' .

اب اُگرپا کا گھر قریب آ گیا تھا، پجاری اُسے گھر چھوڑ کر اپنے گھر لوٹ آیا۔ اُگرپا گھر آتے ہی بستر پر لیٹ رہا۔ اس کی بیوی بھی بستر لگائے بیٹھی تھی۔ آس پاس بچے سو رہے تھے۔ اُگرپا کی ماں تو پہلے ہی دالان میں بستر لگائے بیٹھی تھی۔ جوں ہی بیٹا بچھونے پر لیٹا وہ اُس کے پاس آ بیٹھی اور بولی۔ ''نیا سال آ گیا، میں سوچ رہی تھی کہ اماواس گزر جائے تو وہ بات کہوں، اب مجھے وچن دو۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے میرا ارمان پورا ہو جائے۔''

''اچھا اماں، کل اس کے بارے میں بات چیت کریں گے۔'' اُگرپا بولا۔

ماں بولی۔ ''کل کیا ہے اور میں کون ہوں؟ آج ہی ہاں کہہ دے، آج کا دن شبھ دن ہے۔ اللہ رکھے لڑکا جوان ہو گیا ہے اور لڑکی تو بس گڑیا ہے گڑیا۔ ایسی خوبصورت۔ تیری بیوی تو چاہتی ہے کہ اپنی بھتیجی کو بہو بنا کر لائے اور وہ لڑکی تو بونی ہے چھڑی کی طرح۔ بالکل دُبلی پتلی۔ تُو میری بات سُنے گا تو میرا ارمان پورا ہو گا۔ میں مر جاؤں تو بچے کی شادی وہاں کبھی نہیں ہو گی۔''

اُگرپا کی بیوی وہیں سے بول اُٹھی۔ ''آج تہوار کا شبھ دن ہے۔ تم مرنے ورنے کی، ایسی بُرے شگون کی باتیں کیوں کر رہی ہو، اماں؟ تمھارا بیٹا تمھاری چھوڑ کر میری خواہش کب پوری کرے گا؟ ماں، بیٹا اور بیٹا، ماں۔ میں کس حساب میں ہوں؟ میری بھتیجی بالکل دُبلی پتلی چھڑی ہی سہی، اور تمھاری تو اسی حُسن کی پُتلی۔ کیا میرا بھی ارمان نہیں کہ میرا بیٹا ایک خوبصورت لڑکی بیاہ لائے۔ تمھاری گُڑیا کو لا کر، اسی کو دُلھن بناؤ۔ میں نہ کہہ رہی ہوں؟ میرا بھائی پوچھے تو کہہ دوں گی، تمھاری ضد تھی کہ اس کی بیٹی نہیں چاہیے۔ تب وہی جان لے گا تمھارے گُن۔''

''تو بیٹا لے، اب تو تیری بیوی بھی مان گئی۔ صرف اب تو کہنا باقی ہے۔''

''اچھا ماں، تمھاری بہو بھی غیر نہیں ہے۔ تم اسے اس لیے بہو بنا کر لائیں کہ وہ تمھاری بھتیجی تھی۔ اگر وہ بھی اپنی بھتیجی کو بہو بنا کر لانا چاہتی تھی، تو کیا بُرا کر رہی تھی؟ اور تم رضامند نہیں، تو وہ ہٹ کرے گی؟ تمھاری خوشی میں اس کی بھی خوشی ہے۔''

بوڑھی یہ کہتے ہوئے اُٹھی۔ ''آج تو میں چین سے سوؤں گی بیٹا۔'' جب ساس اُٹھ کر چلی گئی تو اُگرپا کی بیوی اُس کے پاس آ بیٹھی اور اس کے لیے پان بنانے لگی۔ پان لگا کر اُگرپا کو دیا تو وہ پان چباتے ہوئے بولا۔ ''تم اپنی پسند کی لڑکی لانے کے لیے اماں کو قصوروار ٹھہرا رہی ہو؟ کہ اُس نے تمھاری بھتیجی کو چھوڑ دیا؟ بڑی چالاک ہو تم!''

اُس کی بیوی بولی۔ ''اگر میں نہ کہوں تو کیا تم اپنی بھانجی کو چھوڑ دو گے، اچھا اگر سارا الزام اماں کو نہیں دینا چاہتے تو آدھا تم لے لو۔''

''اچھا، تمھارے حصے کا الزام بھی لے لوں؟'' اُگرپا نے ہلکے سے بیوی کا گال چھوتے ہوئے کہا۔ اُس کی بیوی کے کلّے میں پان ٹھُسا ہوا تھا۔ اُسے یہ ہلکا سا مَس بہت بھلا لگا اور یوں اُگرپا کے لیے سال کا دن ہنسی خوشی اور پیار میں ختم ہوا۔

دہی والی

(ماستی وِنکٹیش آئینگار)

دہی والی منگماں برسوں سے ہمیں دہی دیتی آرہی ہے اور شہروں میں یہ معمول ہے۔ دہی والی ہر روز دہی دے جاتی ہے اور مہینہ کے آخر میں دام چکائے جاتے ہیں لیکن یہاں تو نقد سودا ہے۔ مال لو، دام دو۔ اس پر فائدہ یہ کہ جس دن جتنا دہی چاہو لے کے کھاؤ۔ کبھی کبھار مہمان آ گئے، زیادہ دہی لے لیا دام چکا دیے۔ یہ نہیں کہ ہر روز پاؤ پاؤ ڈیڑھ پاؤ ہی لو، تو یہ دہی والی اکثر ہمارے گھر پر سے گزرا کرتی ہے۔ اس وقت وہ اندر آ کر پوچھ لیتی ہے کہ ہمیں دہی چاہیے یا نہیں۔ ہمیں ضرورت ہے تو لے لیتے ہیں اور بازاری نرخ کے مطابق دام چکا دیتے ہیں۔ یہ دہی والی آوالور کے قریب ہی کسی گاؤں کے رہنے والی ہے۔ ارے، میں بھول رہی ہوں کوئی بھلا سا نام ہے اس گاؤں کا دنکا پور یا ایسا ہی کچھ اور۔ تم جانو، غریب بیچاری مجھے اس پر بڑا ترس آتا۔ اس کا دُکھ درد پہچان کر میں نے ہمدردی جو جتائی تو گاؤں سے آتے جاتے دونوں وقت ہمارے گھر آنے لگی۔ وہیں انگنائی میں بیٹھ کر پان چباتی چباتی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتی۔ مجھے کبھی فرصت ہوتی، تو اپنی رام کہانی لے بیٹھتی۔ اپنے گھر کی تکلیفوں کا ذکر کر کے دُکھڑا روتی۔ پھر مجھ سے پوچھتی اپنے گھر کے بارے میں کچھ کہوں۔ یہ لو، مجھے کیا دُکھ ہے۔ پرماتما کی دَیا سے ہمارے گھر میں سب بخیر ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتی ''آج کہیں سے موٹی بلّی آ کر سارا دودھ پی گئی''۔ ''چوہے رات ہی رات گگڑی چٹ کر گئے'' میں اسے یہ چھوٹی چھوٹی باتیں سُنا چکتی تو وہ ایک سرد آہ بھر کر کہتی ''لتماں یہی دُنیا کے طور ہیں۔'' اور اپنے تجربہ کی بنا پر مجھے بہت سی باتیں سکھاتی۔ یوں میں اور منگماں گھل مِل گئے۔

ایک دن، کوئی ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔ منگماں آئی اور پوچھنے لگی، ''دہی چاہیے؟''

میں کہیں اندر تھی۔ میرے چھوٹے لڑکے نے کہا ''ہاں'' اس نے اپنے ننھے ہاتھ پھیلا دیے ''ہمیں چاہیے، ہمیں دو۔'' منگماں سر سے دہی کا ٹوکرا اُتار کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ دہی کا ایک موٹا سا چکتہ نکال کر اس نے بچے کے ہاتھ پر رکھا اور کہنے لگی ''اماں کو بلا لاؤ۔ مجھے جلدی جانا ہے۔'' اتنے میں، میں خود آ گئی۔ ''اماں تم نے کیسا لعل پایا ہے، نیک مائی کا نیک سپوت، لیکن یہ سب کچھ چند دنوں کے لیے ہے مائی، جب بڑا ہوگا تو تمھاری پروا تک نہیں کرے گا۔ ایک اور عورت اس کے دل پہ قبضہ جما لے گی۔ وہی بیٹا جس کا ماں، ماں کہتے منہ نہیں سوکھتا یہ بھی نہیں پوچھے گا کہ ماں زندہ ہے یا نہیں۔''

''کیوں منگماں؟ کیا ہوا آخر۔ کیا تمھارے بیٹے نے تمھاری کوئی بات نہیں مانی؟''

''رہنے دو ماں۔'' منگماں بولی ''خود میرے آدمی نے میرا خیال نہیں رکھا تو بیٹے سے کیا اُمید؟''

''تمھارے پتی نے تمھارا خیال نہیں رکھا منگماں؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ ایک لمبی بپتا ہے مائی۔'' منگماں بولی۔ ''میں نے کبھی اچھی بھڑکیلی ساری نہیں پہنی۔ ایک دوسری عورت پہنتی تھی۔ اس ساری کے چمکدار رنگ نے انھیں اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ اس عورت کے پاس چلے گئے۔ میں پھر بھی چپ رہی۔ مرد کو اختیار ہے، جیسا چاہے کرے۔ عورت کے لیے یہی بس ہے کہ اس کا گھر ہے اور پتی جنھیں وہ اپنا کہہ سکتی ہے، اس لیے میں نے یہ خاموشی سے سہہ لیا لیکن مائی میں نے گناہ کیا۔ میں نے اکسیر بیچی اور اپنے آدمی کو کھو لیا۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے، جو ہونا تھا ہوا۔ لیکن مائی! میری ایک پرارتھنا سنو۔ تم اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں بہت خیال رکھنا۔ شام میں تمھارے پتی کے آنے سے پہلے کوئی اچھی سی ساری پہن لیا کرو۔ مرد کا خیال یکساں نہیں رہتا مائی۔ تمھیں چاہیے کہ کوئی اچھی سی ساری یا پکے رنگ کی چولی پہنا کرو۔ ایسی جو تمھارے پتی کی آنکھوں کو بھائے، پھول عطر خریدو۔ ایسی بنی ٹھنی رہو کہ تمھارے پتی کا جی خوش ہو جائے۔ مثال کے طور پر یہ ساری جو تم نے پہنی ہے، یہ گھر کا کام دھام کرتے وقت پہننے کے لیے تو ٹھیک ہے، لیکن شام میں کوئی بھڑکیلی چیز پہننی چاہیے۔'' میں منگماں کی عقلمندی پر مسکرائی۔ مجھے احساس تھا کہ اس نصیحت کے پیچھے جو گہری دانشمندی تھی، وہ تجربہ سے پیدا ہوئی تھی۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ وہ

تجربہ تلخ تجربہ تھا۔ اس غریب عورت پر مجھے ترس آیا۔ ''ہاں منگتماں! تم سچ کہتی ہو۔'' میں بولی۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ ''دیکھو مائی، پتی کو بس میں کرنے کے لیے چار چیزیں ہیں۔ بیوقوف آدمی کہیں گے، جڑی بوٹی کھلاؤ، گولیاں دو لیکن اس بارے میں یہ کہاوت سچّی ہے کہ مرد کو جڑی بوٹیاں کھلاؤ اور ادھ مُوا کر دو۔ ان واہیات باتوں کو نہ سُنو۔ اس سے بہتر مائی، کبھی کبھی کوئی لذیذ چیز پکا کر اپنے پتی کو کِھلایا کرو۔ اچھے کپڑے پہنو۔ ہمیشہ مسکراتی رہو، ان کے سامنے اَدا سے چلو پھرو، گھر میں ضرورت کی چیزیں ایک ہی وقت منگالیا کرو۔ یہ چاہیے وہ چاہیے سو بار نہ پوچھتی رہو۔ آج ایک پائی، کل ایک پائی کر کے کچھ نہ کچھ بچا رکھو۔ جب تمھارے پتی کو ضرورت پڑے تو اس میں سے کچھ دیا کرو۔ یہی مائی سب سے بہتر جڑی بوٹی ہے۔ اگر گھر والی ان باتوں کا خیال رکھے تو وہ گھر کے کتّے کی طرح رہے گا نہیں تو گلی کے کتوں کی طرح مارا مارا پھرے گا۔'' مجھ پر منگتماں کی عقلمندی کا بہت اثر ہوا۔ پھر ہم نے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور وہ چلی گئی۔

کوئی دو ہفتہ بعد ایک دن منگتماں بہت اُداس نظر آتی تھی۔ ''کیوں منگتماں کیوں اتنی مایوس ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''آہ مائی! کیا کہوں مجھے کوئی نہیں پوچھتا۔'' ساتھ ہی اس نے ایک گرتے ہوئے آنسو اُنگلی سے سنبھالا۔ میں گھبرا گئی۔ ''کیوں منگتماں؟ مجھ سے نہ کہو گی۔ تم پر کیا بیتی؟ کیا تمھارے بیٹے نے کچھ کہا؟'' ۔ ''ہاں مائی'' منگتماں بولی ''اس کی بیوی اپنے ننّھے بچّے کو مار رہی تھی۔ میں اسے یوں پیٹتے دیکھ نہ سکی، سو میں اس سے بولی ''غریب بچّے کو یوں مار رہی ہے، اے سنگ دل عورت'' صرف اتنی سی بات پر وہ مجھ پر برس پڑی۔ وہ کوسنے دیے۔ میں نے ڈانٹا ''ذرا سنبھل کر بات کر۔ دیکھ کس کے سامنے بات کر رہی ہے۔ میں تیرے پتی کی ماں ہوں۔ اُسے آنے دے، سب کہہ دوں گی۔'' پھر اس کا پتی آیا تو میں نے اس سے کہا ''وہ بڑی بے رحمی سے بچّے کو مارتی ہے۔ میں کچھ کہوں تو مجھی پر جھپٹ پڑتی ہے، ذرا نصیحت تو کر اسے'' بہو نے اسے بات تک نہ کرنے دیا ''وہ کیا نصیحت دیں گے مجھے، بچّہ شرارت کرے تو کیا مجھے مارنے کا حق نہیں؟ کیا میں نے اسے نہیں جنا۔ جیسا تم نے میرے اس پتی کو جنا ہے۔ نصیحت وصیحت، اس طرح کی فضول بکواس نہ کرو۔'' کیا بولوں مائی! تم جانو اس کے بعد کیا ہوا۔ سب کچھ کہہ سُننے کے بعد بھی میں

تو صرف اس کی ماں ٹھہری، وہ اس کی پتنی ہے۔ وہ اُسے ڈانٹے گا تو برابر کا جواب دے گی لیکن مجھے وہ بے دھڑک ڈانٹ سکتا ہے۔ بولا ''ہاں ماں! وہ اپنے پیٹ کے بچّے کو مارتی ہے تو تم کیوں دخل دیتی ہو۔ اگر کچھ کہنا ہے تو مجھ سے کہا کرو۔'' میں نے پوچھا ''تو کیا میں غلطی پر تھی کہ اسے روکا؟'' ''صحیح یا غلط ماں، یہ دوسرا معاملہ ہے مگر ایک عورت کو اختیار ہے کہ اپنے بچّے کو مارے'' میں صبر نہ کر سکی مائی! چند الفاظ میرے منہ سے نکل گئے۔ ''تو کیا کہہ رہا ہے لڑکے۔ تجھ پر تو جورو کا جادو چل گیا ہے، کیا تُو تب بھی اسے چُپ چھوڑے گا، چاہے وہ بچّے کو مارے یا مجھے گالیاں دے۔ ہوں بات بہت بڑھ چلی ہے۔ اگر کل کا دن وہ مجھے گھر سے باہر نکالنے کے لیے کہے تو شاید تُو وہ بھی کرنے کے لیے تیار ہے۔'' میرے بیٹے نے کہا ''پھر کیا کروں ماں، تم کہتی ہو اگر وہ یہاں رہے گی تو تم نہیں رہ سکتیں۔ تم یہاں رہنا چاہتی ہو تو میری بیوی نہیں رہ سکتی۔ اس بے بس عورت کا کیا بنے گا، اگر میں اسے نکال دوں''۔ ''تو کیا میں بے بس نہیں ہوں؟''۔ ''نہیں ماں، تمھارے پاس روپیہ ہے، گائے بھینسیں ہیں۔ دہی بیچ لیتی ہو۔ اب تم میری روٹی کی محتاج نہیں ہو''۔ ''لڑکے کیا تو مجھ سے الگ ہونے کے لیے کہہ رہا ہے؟'' ''جیسی تمھاری مرضی ماں، تم الگ ہونا چاہتی ہو تو میں نہ نہ کہوں گا۔ میں تمھارے جھگڑوں سے تنگ آ گیا ہوں''۔ ''اچھا اگر تُو یہی چاہتا ہے تو آج کی دوپہر سے الگ رہوں گی۔ تُو اور تیری جورو میری بلا چین سے رہو'' اور میں دہی لے کے چلی آئی مائی!''

اپنی بپتا سنا کر منگتاں جی بھر کے روئی۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ میں نے اسے تسلّی دینے کے لیے ہمدردی کے چند الفاظ کہے۔ ''ان باتوں پر زیادہ دھیان نہ دو منگتاں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

پھر میں نے دہی خریدا اور وہ چلی گئی۔

دوسرے دن وہ اتنی اُداس نہیں تھی۔ مگر ہمیشہ کی طرح خوش بھی نہیں تھی، اس لیے میں نے پوچھا ''وہ پھر مل تو نہیں گئے؟''۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے مائی! وہ قطامہ بہو مجھے اپنے بیٹے سے ملنے دے گی؟'' میں جب دہی بیچ کر لوٹی وہ میرے لیے ہانڈی برتن الگ کر رکھی تھی۔ اُس نے ایک بڑی سی ہانڈی میں راگی بھی نکال رکھی تھی اور چھوٹی چھوٹی ہانڈیوں میں نمک مرچ، سب کچھ تھوڑا تھوڑا نکال رکھا تھا۔ پتی پتنی دونوں کھانا کھا چکے تھے۔ وہ بڑی بے پروائی سے بیٹھی تھی۔ ہم کیسے مل

سکتے تھے مائی؟ میں نے گھر کے دوسرے حصہ میں کھانا پکایا اور اکیلی ہی بیٹھ کر کھائی، میری ہی غلطی تھی کہ ایسا بولی۔ انھوں نے دیکھ کر ایک دوسرے سے کہا ''ہاں، یہی ٹھیک ہے''۔ ''بیاہ کے بعد بیٹا بیٹا نہیں رہتا مائی! اس کو ماں نہیں چاہیے تو میں کیوں اس پر بار بن کر پڑی رہوں۔ میں بولی اچھا، اور اب الگ ہی رہا کروں گی۔ ہر روز جب میں گھر سے نکلتی تھی تھوڑا سا دہی میرے پوتے کو دے آتی تھی، لیکن آج اس کی ماں اس سے پہلے ہی اسے کہیں بھیج چکی تھی۔ وہ ٹھان چکی ہے کہ میں بچے کی صورت بھی نہ دیکھوں'' مجھے بہت حیرت ہوئی کہ اتنی چھوٹی سی بات پر یوں پھر گئی۔ مگر میں اس بارے میں کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ میں اس کے ساتھ دوسری باتیں کرتی رہی اور اسے بھیج دیا۔''

دو تین دن تک گھر کی بات نہ اُٹھی مگر منگتماں کے برتاؤ سے مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ ابھی تک الگ ہی بسر کر رہی ہے۔ تیسرے یا چوتھے دن منگتماں پوچھنے لگی ''مائی یہ مخمل جو تم نے پہنا ہے کتنے میں گز آئے گا؟''۔ ''کیوں کسے چاہیے منگتماں؟'' میں نے پوچھا۔ ''دیکھو مائی! میں نے آج تک پائی پائی جوڑ رکھی، اپنے بیٹے اور پوتے کے لیے۔ اب کیوں جمع کروں۔ میں بھی اسی طرح کا مخملیں کرتا پہنے پھروں گی۔'' میں نے اسے بتایا کہ ایسا کُرتہ سات آٹھ روپیہ میں بنے گا۔ اسی دن منگتماں نے وہ کپڑا خریدا اور درزی کو دے آئی۔ دوسرے دن جب وہ گاؤں کو واپس لوٹ رہی تھی، میں نے اسے مخملی جاکٹ پہنے ہوئے دیکھا، دیکھو ماں، میں کیسی بھلی لگتی ہوں۔ جب میرا پتی زندہ تھا، میں نے کبھی قیمتی ساری نہیں پہنی، وہ ایک دوسری عورت کے پاس گیا جو مجھ سے اچھا پہنا کرتی تھی۔ میں نے اس بیٹے کے لیے پائی پائی جوڑ رکھی اور پتی کو کھولیا۔ اب یہی بیٹا میرے ہاتھوں سے نکل گیا ہے، اور اب دیکھو میری طرف نیا بناؤ سنگار کیے کیسی خوبصورت لگ رہی ہوں۔'' مجھے احساس ہوا کہ بیٹے کی جدائی کا منگتماں کے دماغ پر اثر پڑا ہے۔ زیادہ غصہ یا رنج آدمی کو پاگل سا بنا دیتا ہے۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ اس جاکٹ کی وجہ سے اس نے دوسروں سے بھی لڑائی مول لی۔ کہتے ہیں اس کے گاؤں کا ایک لڑکا شہر میں پڑھا کرتا ہے، مہذب ہے جیسا کہ پڑھے لکھے لوگ پہنتے ہیں، وہ بھی فرنگیوں کی طرح کالر اور ٹائی پہنا کرتا ہے، اُس نے منگتماں کو دیکھا تو کہہ اُٹھا۔ ''او منگتماں! تم تو فیشن ایبل بن گئی ہو، مخملی جاکٹ پہن کے!'' ''کیا ہے چھوکرے''

منگتاں ڈانٹ کر بولی۔ ''تُو ادب، قاعدہ بھول رہا ہے۔ تُو کیوں یہ چیز گردن میں پہنے ہوئے ہے۔ میری خواہش ہے تو میں کیوں نہ ایسی جاکٹ پہنوں۔'' یونہی ان میں جھگڑا ہو گیا۔ دونوں طرف سے باتیں چلنے لگیں۔ لوگ سُن کر ہنسنے لگے۔ اس واقعہ نے منگتاں کو بہت چڑچڑا کر دیا تھا۔ دوسرے دن منگتاں نے مجھے یہ سب قصہ سُنایا۔ اس کی بہو بھی بہت کچھ کہتی تھی زور زور سے تا کہ منگتاں کو یہ سُن کر دُکھ پہنچے۔ ''میری بوڑھی ساس کو دیکھو'' وہ کہتی ''جب ہم ساتھ رہتے تھے اس نے ایک سستی چولی تک نہ دی، اب الگ ہونے کے بعد دیکھو مخمل کی جاکٹ پہنے پھر رہی ہے۔''

منگتاں اپنی بہو کے پہننے اوڑھنے کے بارے میں اتنی بے پروا نہیں تھی۔ وہ جب بہو کو گھر لائی تھی، اس نے اپنے کرن پھول، پونچیاں، مالا، کمرپٹی، سر کے گہنے اور دوسری چیزیں دی تھیں جنھیں اس نے پہنے بغیر برسوں سے رکھ چھوڑا تھا۔ شادی کے بعد بھی ہر سال وہ اپنی بہو کے لیے کوئی چھوٹا موٹا زیور بنا دیا کرتی تھی۔ مگر بہو تو یہ سب کچھ بھول گئی تھی اسے تو صرف مخملی جاکٹ کی لگی تھی۔ غریب بڑھیا یہ طعنہ ایک دو دفعہ سُن کر چپ ہو رہی، مگر جب بہو بار بار یہی بات دہراتی رہی تو وہ صبر نہ کر سکی۔ اسی شام اپنے بیٹے سے بولی ''تیری جورو طعنے دیتی پھر رہی ہے کہ میں نے اسے ایک چولی تک نہیں دی، جس وقت ہم ساتھ رہتے تھے کیا میں نے اسے کچھ بھی نہیں دیا؟ کیا میں نے پونچیاں، کرن، کمرپٹی اور دوسرے زیور نہیں دیے؟'' منھ کے کھولنے سے پہلے بہو بول اُٹھی۔ ''اگر ایک وِدوا عورت جس کا پتی مر چکا ہے، کرن پھول اور مالا پہننا چاہتی ہے تو شوق سے پہنے، مجھے نہیں چاہیے اس کا مال۔'' اس کے مرد نے ڈانٹا ''یہ کیا کہہ رہی ہے، بہت بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی ہے'' پھر اس نے ماں سے کہا ''اماں میں تمھارے روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ تم جو چاہتی ہو کرو۔ اگر تمھیں کرن، کمربند اور گہنے چاہئیں تو لے لو۔'' منگتاں نے مجھ سے کہا۔ ''دیکھا مائی یہ بیٹا اپنی جورو سے اتنا بھی نہیں کہہ سکا کہ ہر کسی سے میرے بارے میں ایسی باتیں نہ کرتی پھرے، لیکن مجھے وہ یہاں تک کہنے پر تیار ہو گیا کہ گہنے واپس لے لوں۔ اُس نے بیوی کو سُدھارنے کی بجائے غلطی میرے سر تھوپ دی۔ بیوی کو کچھ نہ کہا۔ اس کے بعد میں کس لیے جیوں مائی؟''

مجھے منگتاں کا حال سُن کر بہت رنج ہوتا تھا۔ غریب بوڑھی بے بس تھی۔ اس کا یہ ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کی بہو کیوں اپنے پتی اور ساس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر یہ غلط فہمیاں کیوں؟ صرف اس بات پر کہ بڑھیا نے بہو کو پوتے کو مارنے سے روکا۔ لوگ کیوں ایسا برتاؤ کرتے ہیں؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ پھر مجھے خود احساس ہوا کہ جھگڑے اسی طرح اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جب دو آدمی ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں تو ذرا سی چنگاری سے شعلہ بھڑک اُٹھتا ہے۔ جھگڑا بڑھتے بڑھتے بہت دُور تک پہنچ جاتا ہے۔ کوئی بات ہی نہیں ہوتی، پھر بھی سب کو دُکھ اُٹھانا پڑتا ہے۔

چند دِنوں بعد منگتاں مجھ سے کہنے لگی "مائی تم بڑی اچھی ہو۔ میرے پاس کچھ روپیہ پیسہ ہے۔ میں تمھیں دُعائیں دوں گی۔ یہ روپیہ کوئی ایسی جگہ جسے بنک کہتے ہیں جمع کرادو۔ گاؤں میں آدمی میرے روپیہ پر نگہ ڈالنے لگے ہیں۔"

میں نے پوچھا وہ کیوں ایسا کر رہی ہے؟ دیکھو مائی، ہمارے گاؤں میں ایک ہے رنگپا۔ وہ اور دوسرے لوگ جوا کھیلتے ہیں اور لڑتے ہیں۔ کل جب میں وہی لیے آرہی تھی وہ مجھے راستہ میں ملا کہنے لگ "کیسی ہو منگتاں؟ خوش تو ہو؟" میں بولی "مجھے کس بات کی خوشی ہے رنگپا جو تم سے چھپی ہوئی ہے؟" "سچ کہتی ہو" اس نے کہا۔ "اس زمانہ میں لوگ جیسا برتاؤ کرتے ہیں اس سے خوشی کی کیا اُمید؟ جوان چھوکرے بڑوں کا ادب بھول بیٹھے ہیں۔ ہم بوڑھے دُکھ اُٹھانے اور صبر کرنے کے سوائے کیا کر سکتے ہیں۔ نہ جانے دُنیا کو کیا ہو گیا ہے۔" ہم کچھ دیر تک ساتھ چلتے رہے۔ راستہ میں ایک جگہ درختوں کا جھنڈ اور ایک کنواں ہے، سُنسان سی جگہ ہے۔ میں ڈر رہی تھی کہ یہ آدمی وہاں لے جا کر کیا کرے گا، اس لیے کہ اس تھیلی میں میرے پاس تھوڑا روپیہ تھا۔ ہم جب اس جگہ پہنچے۔ رنگپا نے مجھ سے چُونا مانگا۔ میں نے تھوڑا سا چونا دیا اور وہ لے کر چلا گیا۔ آج پھر وہ وہی جگہ ملا اور اس جھنڈ تک میرے ساتھ باتیں کرتا ہوا آیا اور بولا "منگتاں مجھے کچھ روپیہ چاہیے۔ تم مجھے اُدھار دو گی؟ راگی کی فصل کٹتے ہی میں تمھارا روپیہ ادا کر دوں گا۔" بھائی! میرے پاس روپیہ کہاں ہے کہ تمھیں اُدھار دوں؟" کیا میں نہیں جانتا منگتاں؟ ایک جگہ روپیہ گاڑ رکھنے سے تمھیں کیا ملے

گا۔ مجھے اُدھار دو گی تو میرا کام بھی چل جائے گا اور تمھیں بھی کچھ سود ملے گا۔'' ایک لمحہ بعد وہ کہتا ہے ''اگر تم اپنے بیٹے کے ساتھ رہتیں تو میں تم سے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا۔ بہو کو چھوٹا موٹا گہنا بنانے کے لیے تمھیں اس روپیہ کی ضرورت ہوتی، مگر اب تو یہ بوجھ بھی اُتر گیا ہے، اس لیے پوچھ رہا ہوں۔'' دیکھو مائی، منگتاں نے کہا۔ ''اکیلی دکیلی عورت پر کس طرح ہر کوئی نگاہ ڈالتا ہے۔'' میں نے منگتاں کو تسلی دی کہ میں اپنے پتی سے پوچھوں گی کہ ہم اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ اس دن مجھے اپنے شوہر سے یہ بات کہنے کا موقع نہ ملا۔ دوسرے دن جب وہ دہی دے چکی، اس نے روپیوں کی تھیلی نکالی اور کہا ''یہ اندر لے جا کے دیکھو مائی، گن کے دیکھو کتنا روپیہ ہے۔'' میں نے کہا میں نے ابھی تک اس بارے میں پتی سے بات نہیں کی ہے، وہ روپیہ کسی اور دن لائیے۔ ''اوہ! نہیں مائی، میں یہ روپیہ ساتھ لیے پھرنے سے ڈرتی ہوں۔ آج بھی یہ رنگپا مجھے راستہ میں ملا۔ جب ہم اسی جھنڈ کے پاس پہنچے تو وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور مجھ سے بھی بیٹھنے کے لیے کہا۔ ''ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ کچھ دیر تو بیٹھو۔'' اور میرے پاس یہ روپیہ تھا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اگر میں انکار کر کے چل دیتی اور وہ مجھے زبردستی روک لیتا تو میں کیا کر سکتی تھی، اس لیے بیٹھ گئی۔ پہلے اُس نے میرے گھر کی باتیں کیں۔ پھر ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا ''تم کتنی حسین ہو؟'' سُنتی ہو مائی! جب میں خوبصورت اور جوان تھی، اس آدمی نے جو میرا پتی تھا میرا ہاتھ پکڑنا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کوئی بھی مجھے چھو نہ سکا۔ اب برسوں بعد آج یہ تو میرا ہاتھ پکڑتا ہے۔ میں ہاتھ چھڑا کر بولی ''یہ کیا ہے رنگپا، کیا میں اور تُو عاشق و معشوق ہو بیٹھے ہیں کہ ایسی بات کہہ رہا ہے؟'' میں اُٹھ کر جلدی جلدی چلی آئی۔ کل اُس نے میرا روپیہ مانگا تھا، آج مجھی کو مانگتا ہے۔ وہ جو میرے ساتھ شادی کی گدی پر بیٹھے مدّت گزری دوسری دُنیا کو سدھار گئے۔ وہ مجھے چھوتے نہ تھے، گو جب میں راضی تھی۔ اگر دوسری عورت ہوتی تو کہتی ''اگر شوہر نہیں تو دوسرا عاشق ہی سہی'' اور نہ جانے کیا کیا کھیل کھیلتی، لیکن میں نے اپنی عزت کا خیال کر کے اس بے پروائی کو سہہ لیا۔ اب جبکہ میری جوانی ڈھل چکی ہے اور بوڑھی ہو چکی ہوں یہ شہدا آ کر میرا ہاتھ پکڑتا ہے۔ جیسے وہ میرے شوہر سے زیادہ ہے۔ جیسے میں اس کی منکوحہ بیوی ہوں۔

مجھے محسوس ہوا منگتاں کی کہانی عجیب شکلیں اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ''منگتاں!'' میں نے کہا ''تم کیوں یہ سب اپنے سر لے رہی ہو۔ کیوں نہیں بیٹے کے پاس واپس چلی جاتیں۔''

''میں جانے کے لیے راضی ہوں مائی، مگر بہو مجھے آنے دے گی؟''

''تمھارے بیٹے کو اس رنگپا کے بارے میں بتلا دو۔''

''اوہ مائی! یہ کیسی شرم کی بات ہوگی۔ میری بہو سُن پائے تو گلیوں میں چیختی پھرے گی۔ مجھے ذات باہر کروا کے چھوڑے گی۔ اب دیر ہو رہی ہے مائی۔ مجھے جانا چاہیے۔ اتنی دَیا کرو کہ یہ روپیہ بنک میں رکھوا دو۔'' غریب عورت چلی گئی۔ ایک گھنٹہ میں وہ پھر واپس آئی۔

''مائی! آج ایک بات ہوگئی مائی! میں کیا کروں مائی! اب کیا کروں۔''

''کیا ہوا منگتاں؟''

''دیکھو مائی! میں نے بچے کے لیے تھوڑی سی مٹھائی خریدی اور اسے ٹوکری پر رکھ لیا۔'' چونکہ منگتاں نے کہا تھا بہو بچے کو اُس کے پاس آنے نہیں دیتی۔ میں اس کی بات سمجھ نہ سکی۔ میں نے پوچھا ''تم تو کہہ رہی تھیں منگتاں کہ بچہ تمھارے پاس نہیں آتا۔ پھر مٹھائی کیوں خریدی تم نے؟'' وہ کچھ دن کی بات تھی مائی اگر اس کی ماں اسے میرے پاس بھیجنا نہیں چاہتی تو کیا بچہ میرا دامن چھوڑ دے گا؟ وہ میرے پاس آتا ہے مائی۔ ماں کی آنکھ بچا کر۔ میں اُسے دودھ دیتی ہوں۔ وہ پی کر دہی پوچھتا ہے۔ وہ بھی دیتی ہوں تو خوشی سے ناچ اُٹھتا ہے۔ جب زیادہ شور کرنے لگتا ہے تو میں ڈراتی ہوں ''تمھاری ماں سُن لے گی'' تم باور کرو گی مائی، وہ معاً چُپ ہو جاتا ہے۔ بچوں کا کھیل کیسا پیارا لگتا ہے مائی! سو آج میں نے اس کے لیے مٹھائی خریدی اور ٹوکری پر رکھی۔ یہ شنکر پور کا نام تم نے سُنا ہوگا، وہیں سے گزر رہی تھی۔ ایک کوا آم کی ڈالی پر سے اُڑ کر میرے سر پر آ بیٹھا اور مٹھائی کی پڑیا اُٹھا لے گیا۔ ہائے اب کیا کروں۔''

''ذرا سی مٹھائی کے لیے کیوں افسوس کر رہی ہو منگتاں، دوسری خرید لو۔''

''یہ بات نہیں مائی۔ لوگ کہتے ہیں کوا آدمی کے جسم سے نہیں چھونا چاہیے۔ اسی لیے پریشان ہوں۔''

''کوے کے چھونے سے بھلا کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''کہتے ہیں موت کی نشانی ہے۔'' منگتاں نے جواب دیا۔ ''مجھے خوف ہوتا ہے کہ میرے دن ختم ہو چکے ہیں۔ میں دل میں یہی کہتی ہوں کہ مر جاؤں تو بہتر ہے۔ کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ میں جیوں۔ میں ایشور کے چرنوں میں پڑی رہوں تو اس میں کیا بُرائی ہے۔''

''کیسی بے تکی باتیں کر رہی ہو منگتاں۔ تم خود سر پر مٹھائی رکھ لیتی ہو اور راستہ سے گزرتی ہو تاکہ کوئی کوا دیکھ پائے۔ جب کوا پڑیا اُٹھا لے جاتا ہے تو کہتی ہو میرے دن ختم ہو گئے۔ ایسے بیہودہ خیالوں میں وقت نہ گنواؤ۔ جا کے اپنے پوتے کے ساتھ جی بہلاؤ۔''

''تو کوئی ڈرنے کی بات نہیں مائی؟''

''بالکل نہیں۔ اب کوے اور مٹھائی کو بھول جاؤ۔ ہنستی ہوئی اپنے گھر کی راہ لو۔''

منگتاں اپنے گاؤں چلی گئی۔ میں اس غریب بیچاری کے خیالات کا اندازہ کر کے حیران ہوتی رہی۔ یہ غریب عورت جو کبھی اپنے بیٹے سے محبت کرتی تھی، کبھی بہو سے، کبھی پوتے سے، مگر سب سے بڑھ کر اس کے دل میں یہ خواہش تھی کہ وہ اسے مالکن سمجھیں۔ اس کا احترام کریں۔ سبھی کو اقتدار سے محبت ہوتی ہے۔ سبھی زندگی سے محبت کرتے ہیں۔ آدمی زندگی سے بیزار ہو کر بھی مرنا نہیں چاہتے لیکن بظاہر یہ بتاتے ہیں کہ وہ مرنا چاہتے ہیں اور یہ تو سیدھے سادھے بھولے بھالے دیہاتی ہیں، ان کے دماغ میں بھی کیسے تہ بہ تہ پردے ہیں۔ ایک پردہ دوسرے پردہ کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ یہ کیسا ڈرامہ ہے؟

اب منگتاں پھر آئی۔ وہ اپنی اس نئی زندگی کے اور قصے سُنانے لگی، کہ اس کے پوتے نے آج ماں باپ کے پاس جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اپنی دادی کے ہاں ہی رہا۔ بوڑھی منگتاں اس دن بے حد خوشی تھی۔ ''اس چھوٹے سے چھوکرے کی ہمت تو دیکھو'' وہ بولی ''دیکھنے کو صرف دو بالشت ہے مائی!'' کیا کوئی دوسرا بچہ اس قدر چھوٹا اپنی ماں کو چھوڑ سکتا تھا۔ وہ کل دوپہر کو میرے پاس آیا۔ جب شام تک بھی نہ گیا تو اس کی ماں ڈانٹنے لگی۔ ''اچھا گھر آ تو ایسا پیٹوں گی'' پھر بھی اس نے دلیری سے انکار کر دیا۔ اور میرے پاؤں سے چمٹا رہا۔ میں نے کتنی بار اس سے کہا کہ اپنی ماں

کے پاس جائے۔ اس کے باپ نے بھی آ کر آواز دی مگر چھوکرا گیا نہیں۔ وہ دن بھر میرے ساتھ رہا۔ میں دس دن سے گھر میں اکیلی سویا کرتی تھی۔ مجھے ڈر سا لگتا تھا۔ اس ذرا سے لونڈے کے پاس سونے سے مجھے ہمت ہوئی۔ کچھ بھی ہو، اماں، گھر میں مرد ہو تو ہمت بندھتی ہے۔ پرماتما کی دیا دیکھو مائی، اتنا چھوٹا لڑکا میرے ساتھ رہنے پر ڈٹ گیا۔ میرا بیٹا جسے میں نے پال پوس کر بڑا کیا۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اب دیکھو تو یہ ذرا سا پوتا کہتا ہے "ڈرو نہیں۔" وہ میری بہو رات بھر جھگڑا لے بیٹھی مگر چھوکرا اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ آج صبح جب یہاں آنے نکلی تو بول چال کرا سے اپنی ماں کے گھر چھوڑ آئی۔ وہ اندر چلا گیا۔ اور میں چلی آئی۔

"تم نے اچھا کیا منگماں" میں نے کہا "لیکن اگر اس کی ماں بچہ کو مارے تو؟" "نہیں مائی وہ کیوں مارے گی۔ وہ خوش ہوگی کہ ایک دن کے لیے تو بچہ گھر آیا ہے۔ جب تمھارا بچہ ہمیشہ پیچھے لگا رہے تو کبھی کبھی مار بیٹھنے کو جی چاہتا ہے لیکن اس وقت نہیں جب کبھی کبھی بچہ تمھارے پاس آئے تو۔ اب میری ہی مثال لو، جب بہو میرے ساتھ رہتی تھی میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا کہ وہ خوبصورت ہے۔ اب دُور سے دیکھتی ہوں تو وہ مجھے بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ کبھی بھوئیں سکیڑ لیتی ہے تو کچھ عجب سی نظر آتی ہے، مگر دوسرے وقت کیسی صورت، کیسی ادا، اب مجھے جان پڑا کیوں میرا بیٹا اس کا غلام ہوگیا ہے۔ بیٹے کی بات بھی یونہی ہے۔ جب میں اس گھر میں تھی، میں اس کے آنے جانے کا خیال نہ کرتی تھی۔ جب اس سے الگ ہوں تو باہر ڈیوڑھی میں بیٹھی پریشان ہوتی رہتی ہوں، وہ ابھی تک گھر کیوں نہیں لوٹا۔ وہ کھیتوں کو اتنا جلد کیوں چلا گیا۔ بہو کا بھی یہی حال ہے۔ اگر وہ آج بچے کو مارے گی تو شاید کل وہ اس کے گھر نہیں جائے گا۔ میں اسے لے آؤں تو بہو چند گھنٹے بھی بچہ کے ساتھ نہ گزار سکے گی۔ اس نے مہینوں اسے پیٹ میں رکھا ہے۔ درد سہے ہیں۔ کیا وہ بچہ کو گنوا لے گی۔"

میں تعجب سے منگماں کی باتیں سُن رہی تھی۔ اسے کتنی دُور کی سمجھ تھی۔ مجھے خیال ہوا شاید جھگڑا ختم ہو جائے گا اور ماں بیٹا اور بہو مل جائیں گے۔ ایسا ہی ہوا۔ دو دن تک بچہ صبح کو ماں کے گھر چلا جاتا تھا لیکن تیسرے دن اپنی دادی کے ساتھ شہر جانے کی ضد کرنے لگا۔ اسے ساتھ لانا بڑھیا

کے لیے مشکل تھا۔ اس نے بچّہ کو سمجھایا کہ ماں کے پاس رہے۔ پھر بھی وہ ضد کرتا رہا۔ اتنے میں اس کا بیٹا اور بہو آ کر التجا کرنے لگے "ہم بیوقوفی میں کچھ کر بیٹھیں" "تمھیں معاف نہیں کرنا چاہیے؟ گاؤں کے چار آدمی بھی آ کر یہی بولنے لگے۔

اور منگتاں اپنے بہو بیٹے کے ساتھ رہنے لگی۔ مگر اس کا پوتا اپنی ضد پر اڑا رہا کہ وہ اپنی دادی کے ساتھ شہر جائے گا۔ اب تک دہی بیچنے کا کام منگتاں نے اپنے ہاتھوں میں رکھا تھا۔ بہو کے آنے کے بعد بھی۔ بظاہر سبب یہ تھا کہ بہو گھر کی مالکن ہے۔ گھر میں اس کا حکم چلے گا۔ ساس باہر پھرا کرے گی۔ لیکن اصل میں وہ اس لیے دہی بیچنے جاتی تھی کہ گھر بیٹھے اس کا جی اُکتا تا تھا۔ اور کچھ ٹکے کا لین دین بھی کر سکتی تھی۔ جب اس کا پوتا دادی کے ساتھ جانے کے لیے ہٹ کرنے لگا تو بہو کہنے لگی۔ "تم دھوپ میں کیوں پھرتی ہو اماں۔ اس بڑھاپے میں تم گھر میں مالکن بن کر رہو۔ میں شہر جا کر دہی بیچ آؤں گی۔" منگتاں نے یہ بات مان لی۔ "کبھی کبھی میں بھی لے جاؤں گی۔"

ایک دن ساس بہو دونوں ساتھ آئے۔ ایک نے دہی لے رکھا تھا اور دوسری کے گود میں بچّہ تھا۔ "مائی یہ میری بہو ہے۔ بڑی اچھی بہو ہے۔ اس نے مجھے پھر اپنے گھر جالیا ہے۔ اور اپنی بوڑھی ساس کو الگ پکا لینے کی زحمت سے بچالیا ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ میں دھوپ میں پھرا کروں۔ آج سے دہی تمھارے لیے وہی لایا کرے گی۔" میں نے دونوں سے ہمدردی کی باتیں کیں۔ نصیحت کی کہ ہمیشہ آپس میں محبت سے رہا کریں اور انھیں پان سپاری دے کر رخصت کیا۔ آج کل بہو ہمارے گھر دہی لاتی ہے۔

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ ساس کے نقطۂ نظر سے تھا۔ بہو کا کیا نظریہ ہوگا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔ "بچماں! تم ایسی سمجھدار معلوم ہوتی ہو، تم نے اس غریب عورت کو کیوں اپنے گھر سے نکالا؟"

"مائی ایسا نہ کہو مائی۔ کیا میں کوئی چڑیل ہوں کہ اپنی ساس کو گھر سے نکال باہر کروں۔ یہ میری ساس مجھے کچھ کرنے دیتی تھی؟ میری ہر چھوٹی سی بات میں ٹانگ اڑاتی تھی۔ میرے شوہر کو

بھی گھر کے مرد کی طرح رہنے نہ دیتی تھی۔ وہ خود ہی مالک اور مالکن تھی۔ اب تو یہ ٹھیک ہے۔ لیکن جب وہ ہمیں چھوڑ جائے گی، تو میرے آدمی کو مالک بننے کا سلیقہ کیسے آئے گا۔ اگر ان میں مردانہ رُعب نہ ہوگا تو میں کیسی بیوی ہوں گی۔ مہینوں میں سہتی رہی یہ سوچ کر کہ کچھ بھی ہو اسی نے میرے پتی کو جنا ہے، پالا پوسا ہے۔ اس لیے جب وہ گھر کی مالک بننا چاہتی تھی تو میں نے اسے نہیں روکا۔ مگر وہ اس سے بھی آگے بڑھ گئی۔ کہنے لگی مجھے میرے اپنے بچے کو چھونے کا بھی اختیار نہیں ہے۔ اگر میں اس پر بھی چپ رہوں تو میرے بہوپن میں بھی کیا رکھا ہے۔"

"مگر تم یہ نہیں کہہ سکتیں بنجماں" میں نے کہا کہ "بچے کو کو مارنا ہی اس پر حق جتانے کا ذریعہ ہے۔"

"او مائی! مارنا یا لاڈ کرنا سب ایک ہی ہے۔ ایک دن وہ مجھے بچہ کو مارنے پر روکتی ہے، تو دوسرے دن لاڈ کرنے پر بھی روکے گی۔ ساس کیا کچھ نہیں کرتی۔ اگر وہ مانے کہ بچہ میرا ہے تو وہ میرا ہے۔ اگر وہ میرے پتی کو اجازت دے کہ میرے ہو کر رہیں تو وہ میرے ہیں۔ کیا یوں بھی ہوگا؟ اگر وہ اس غریب بے چاری کو جو بہو بن کر آئی ہے اتنا بھی اختیار نہیں دیتی کہ وہ اپنے پتی سے کچھ نہ کہے یا بچے کو ایک مار نہ مارے، تو وہ کیسی بہو بنے گی؟"

جب منگتماں یہ قصہ سُناتی تھی تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ منگتماں حق پر ہے اور اب محسوس کرتی ہوں کہ بنجماں بھی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ "ہاں، تم جو کہہ رہی ہو وہ بھی ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "تو اب تمھیں گھر میں کچھ اختیار ہے؟"

"ہاں مائی" بنجماں بولی "اس جھگڑے کے بعد سب سدھر گیا ہے۔ ہمیں کسی طرح سے بھی چلانا ہوگا مائی! اگر میں ساس کی باتیں نہ سہہ کر اس سے پھر لڑ پڑوں، تو کیا فائدہ ہوگا؟ کوئی اور اس کا روپیہ چھین لے گا۔ ہمارے گاؤں میں ایک ہے، رنگپا۔ ان دنوں جب میری ساس الگ رہتی تھی وہ جا کر اس سے روپیہ اُدھار مانگنے لگا، اور یہ راضی ہوگئیں۔ جب رنگپا نے یہ بات اپنے قرض خواہوں کو سُنائی تو میں ڈر گئی۔ میں نے ننھے بچے سے کہا کہ اپنی دادی کے پاس جا کر رہے۔ وہ اسے مٹھائی اور دہی دے گی۔ میں نے اسے تاکید کی کہ جب تک میں نہ بلاؤں ہرگز واپس نہ

آئے، یوں میں نے کچھ دن کے لیے بچہ کو اس کے پاس چھوڑ دیا، یہ سوچ کر کہ شاید یوں ہم میں ملاپ ہو جائے۔''

''اوہ'' میں نے کہا ''تو بچہ آپ خود اپنی دادی کے پاس نہیں گیا؟''

''ہاں گیا تو مائی، لیکن میں نے اسے بھیجا۔''

''کیا تم نے اپنے پتی کو یہ بات بتائی کہ تم نے بچہ کو کیوں بھیجا؟''

''نہیں مائی! مردوں کو ایسی بات بتانے سے کیا حاصل؟ وہ ایسی باتوں کو سمجھ نہیں سکتے۔''

میں نے خیال کیا، بنجماں اپنی ساس سے کچھ کم سمجھدار نہیں۔ آج بھی ان کے گھر میں ''بڑپن'' کے لیے کشمکش جاری ہے۔ خصوصاً اس ایک آدمی پر حق جتانے کے لیے جو ایک کا بیٹا ہے، دوسری کا شوہر۔ ماں اس پر اپنا حق جتاتی ہے۔ بیوی اڑی بیٹھی ہے کہ وہ اس کے اختیار میں ہوگا۔ یہ جھگڑا سبھی گھروں میں جاری ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا، یہ کیسے ختم ہوگا۔ بہو اس مگرمچھ کے مانند ہے، جو پانی کے اندر بچہ کا پاؤں پکڑے ہوئے ہے اور ساس اس ماں کی مانند ہے، جو بچے کے ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ رہی ہے۔ یہ بیچارہ شوہر ہی دونوں کے درمیان عجیب مصیبت میں ہے، ہر گھر میں یہی حالت ہے۔ گاؤں میں دہی بیچنے والی منگماں کے گھر بھی یہی قصہ ہے۔ شہر میں دہی خریدنے والی رنگماں کے گھر بھی یہی قصہ ہے۔ شہر میں یا گاؤں میں ہر جگہ یہ ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے، جس کا کوئی آخری ایکٹ نہیں۔

یہاں کا انصاف

(ماستی وِنکٹیش آئینگار)

میرے دادا مسٹر کورٹنی کے جوڈیشیل کلرک تھے۔ جوڈیشیل کلرک یعنی وہی جوڑی شال سرشتہ دار جیسا کہ ہم کہتے ہیں۔ جوڈیشیل سے جوڑی شال ذرا سا تصرف تو ہے اور جوڑی شال کے معنی تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ خیر پرسوں میں پرانے دفتروں کے انبار میں سے جلانے کے لیے بیکار کاغذات الگ کر رہا تھا کہ دادا کے زمانے کی چند دستاویزیں میرے ہاتھ لگیں۔ اس میں مجھے کورٹنی کی ڈائری کے چند اوراق بھی ملے۔ میں نے مسٹر کورٹنی کو دیکھا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ کبھی بھی مجھے مٹھائیاں دیا کرتے تھے۔ بہت نیک اور رحم دل آدمی تھے۔ میں نے ڈائری کو یونہی کہیں بیچ میں سے کھولا اور چند اوراق پر سرسری نظر ڈالی۔ اسے بہت دلچسپ پایا اور ایک پورا حصہ پڑھ ڈالا۔ چند ہی صفحات تھے۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ختم کر لیے۔ تمھاری دلچسپی کے لیے میں یہاں اس قصہ کو نقل کیے دیتا ہوں۔

(۲)

میں نے آج ایک مقدمہ کا فیصلہ سُنایا۔ اس کے مدّعی مسٹر آرتھر ہنری ایک مشنری تھے۔ ملزم دووڈر قوم کے جوان تھے۔ تما بوئی اور راما بوئی۔ مجھے کہنا پڑتا ہے مسٹر آرتھر ہنری بھی الزام سے بری نہیں ہیں لیکن اس احساس کے باوجود میں صرف راما اور تما کو سزا دے سکتا تھا۔ مسٹر ہنری کو نہیں۔ شاید اب یا چند دنوں بعد خود مسٹر ہنری کو احساس ہوگا کہ وہ ٹھیک راستہ پر نہیں تھے۔ اس احساس سے ان کو کچھ ندامت ہوگی۔ یہی اُن کے لیے کافی سزا ہوگی۔ گرجا گھر میں ان کی چند قیمتی اشیا بھی چرالی گئی ہیں۔ یہ گویا ان کے جرم کا جرمانہ ہوا۔ کون جانے شاید خدا بھی جو ہمارے اچھے یا بُرے کاموں کو دیکھتا ہے جیسا کہ مسٹر ہنری خود اپنے وعظوں میں کہتے ہیں، انھیں آئندہ سزا دے

لیکن بہر حال آج صرف تمابوئی اور رامابوئی مجرم ٹھہرائے گئے اور انھیں سزادی گئی۔

یہ دونوں رامپور کے رہنے والے ہیں جو بومیکی تعلق چندراپور میں ہے۔رامپور پچاس ساٹھ گھروں کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ان میں سے کوئی تیس گھر وکلگر قوم کے ہیں جو بڑی بڑی زمینوں کے مالک ہیں، دوسروں کے پاس بھی چھوٹی چھوٹی زمینیں ہیں جن میں وہ ترکاری اگاتے ہیں۔ وڈروں کے بھی چند گھر ہیں۔ یہ قریہ چھوٹا ہے لیکن لوگ کافی خوش حال ہیں۔چونکہ گاؤں میں سے بڑی سڑک گذرتی ہے کافی چہل پہل رہتی ہے۔گاؤں سے کچھ دور پر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر راما کا مندر ہے جسے جاترا کا مرکز ہونے کی وجہ سے کچھ شہرت حاصل ہے۔اس لحاظ سے اس کی قلیل آبادی کے باوجود یہ گاؤں کافی بارونق ہے۔

وڈر لوگوں کی زندگی بھی قریب قریب ایسی ہی جیسے گاؤں کے دوسرے لوگوں کی۔یا تو ان کی اپنی چھوٹی چھوٹی زمینیں ہوتی ہیں یا دوسروں کی زمینوں کی کھیتی کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کی حیثیت اس گاؤں میں پردیسیوں کی سی ہے جیسے کسی دوسری جگہ سے آکر یہاں بس گئے ہوں۔وہ خود بھی اپنے آپ کو''باہر والے''خیال کرتے ہیں۔یہ لوگ اگر پیے ہوئے نہ ہوں تو ہمیشہ اخلاق کا برتاؤ کرتے ہیں۔لوگ خواہ مخواہ ان کے کام میں دخل نہ دیں تو وہ بہت اچھے پڑوسی ثابت ہوتے ہیں۔اگر مجبوری نہ ہو تو وہ ہمیشہ اچھے کام ہی کرتے ہیں۔بارش اچھی برسے اور فصلیں اچھی ہوں تو وہ چوری کے پاس نہیں پھٹکتے۔اگر چہ اناج ان کے سامنے ہی کیوں نہ پڑا ہو اور اس کی نگرانی کرنے والا کوئی نہ ہو، پھر بھی وہ چوری نہیں کرتے۔مذہب پر اعتقاد انھیں سیدھے راستہ پر رکھے رہتا ہے۔

ان کے مذہب میں، جیسا کہ ان وڈر لوگوں کا عقیدہ ہے، مندر میں راما کی مورتی کی پوجا سب سے اہم ہے۔ یہ وڈر لوگ ہم سے اور آپ سے کیے ہوئے وعدے توڑنے سے ذرا بھی نہ چوکیں گے لیکن جو نیاز وہ مندر میں دیوتا سے کرتے ہیں اس کو ہر حال میں پورا کرتے ہیں۔آنکھ جھپکانے میں وہ دھوکا دے کر ہم سے دس روپے لے لیں گے لیکن دیوتا سے دس پائی بھی نہیں۔وہ نہ صرف دیوتا سے کیے ہوئے معاہدے میں پکے ہیں بلکہ ایک دوسرے سے معاملات کرتے وقت

بھی بہت ایماندار ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے مذہب یا دوسری برادری کے لوگوں کو دھوکا دیں گے، تکلیف پہنچائیں گے، ان سے وعدہ خلافی کریں گے، مگر ایک وڈر دوسرے وڈر سے ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ کبھی کبھی میں سوچنے لگتا ہوں کہ خدا سے بھی وہ اتنے ایماندار اس لیے ہوں گے کہ وہ خدا کو بھی شاید وڈر ہی خیال کرتے ہوں۔ مجھے یہ خیال اس لیے ہوتا ہے کہ ہم بھی اسی طرح خیال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے ہم وطنوں ہی کو لیجیے۔ وہ اپنے ہم قوم انگریزوں کے ساتھ کتنے اخلاق سے پیش آتے ہیں لیکن ایک ہندوستانی کے ساتھ وہ کیسا ظالمانہ سلوک کر سکتے ہیں۔ اور جیسا وہ بوئی لوگ اپنے مندروں کی قدر کرتے ہیں ہم بھی اپنے گرجا گھروں کا احترام کرتے ہیں۔ تو یہ وڈر لوگ مذہب اور اخلاق کو عزیز رکھتے ہیں۔ اگر مصیبتیں انھیں مجبور نہ کریں تو سچائی اور دانش مندی سے کام کرتے ہیں اور شریف اور باکار شہری بنے رہتے ہیں۔

ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کے مذہب اور اخلاق کی بنیاد کسی ٹھوس فلسفہ پر نہیں ہے اس لیے ان سے انسان کو رُوحانی بلندی پر پہنچنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ ہم مہذب ہیں اس لیے صرف پیچیدہ چیزیں ہی ہم کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ ایسی سیدھی سادی لیکن گہری عقیدت جیسی کہ ان وڈر لوگوں کی ہے ہمارے دلوں کو مسخر نہیں کر سکتی۔ یہی تو تہذیب و تمدن کی خمیر ہے۔ میں اب تک فیصلہ نہ کر سکا کہ یہی سیدھا سادھا اعتقاد اچھا ہے یا ہمارا۔ سیدھے سادھے آدمی ان کی کوک سے محظوظ ہوتے ہیں۔ انھیں اس کی پروا نہیں کہ یہ کوک ایک ہی طرز پر ہے۔ ہمارے دل کو خوش کرنے کے لیے بی تھاون کی موسیقی بھی ناکافی ہے۔ ہم مہذب ہیں! متمدن ہیں! ہم جب رامابوئی اور اس کے نظریوں کا معائنہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس کا مذہب رُوحانی بلندی پر نہیں پہنچا سکتا۔ اسے ہمارے مذہب کی تعلیم دے کر، ہمارا ہم مذہب بنالینا چاہیے۔ یہی مسٹر ہنری کا نظریہ تھا۔ وہ انگلستان سے ہندوستان کو صرف اسی غرض سے آئے ہیں کہ ہندوستانیوں کو تاریکی سے نکالیں اور اپنی روشنی سے انھیں منور کریں۔ یہ ماننا چاہیے کہ انھوں نے لوگوں کو کچھ فائدہ پہنچایا ہے، لیکن کبھی کبھی فائدہ پہنچانے میں انھوں نے غلط راستہ اختیار کیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے یا اس لیے کہ نیک لوگوں پر مصیبت ضروری ہے، مسٹر ہنری کو بھی تھوڑا نقصان پہنچا۔ اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ

انھیں کی تبلیغ کا یہ نتیجہ ہے کہ راما اور تما آج میرے سامنے مجرموں کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔

راما کا مندر، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، ایک پہاڑی پر گاؤں سے کچھ دور پر واقع ہے۔ میں نے کئی دفعہ یہ مندر دیکھا ہے۔ رامپور کے اطراف کی زمین انتہائی خوبصورت ہے۔ دیہات بومبئی کے جنوب مغرب میں ہے۔ وہی سڑک جو بومبئی سے ہوکر اس قریہ کے پاس سے گزرتی ہے، اچھی بنی ہے۔ ہمارے افسروں کی کوششوں اور یہاں کے لوگوں کے عقیدے کی بنا پر کہ سڑک پر سایہ دار درخت لگانا ثواب کا کام ہے، اس سڑک پر بھی خوبصورت دورویہ درخت لگے ہوئے ہیں۔ رامپور کے قریب سڑک تالاب کے بند سے ہوکر گزرتی ہے۔ قریہ کے سامنے بڑے بڑے قدآور درخت ہیں۔ ایسے جیسے سڑک کے دونوں طرف ہیں۔ پیپل اور بڑ کے درخت، جھنڈ میں ان درختوں میں ایک ایسی شان ہے کہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ صبح کے وقت ہم ان درختوں کا منظر دیکھیں تو ہمارا دل گویا انھیں میں کھو جاتا ہے۔ برگد کے درخت ایک سکون اور بے نیازی سے کھڑے ہوئے، اُونچے پیپل کے درخت جن کی پتیاں نرم رونسیم کے ذرا سا چھوتے سے بھی کھل اُٹھتی ہیں، کتنے شاندار معلوم ہوتے ہیں۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں نہائے ہوئے! جب ہم گاؤں کے اندر داخل ہونے لگیں ہمیں گھر اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سڑک پر گھروں کی قطاریں نہیں ہیں۔ شہر کے لیے یہ ٹھیک ہے لیکن گاؤں میں ایسا بہت چھوٹا نظر آئے گا۔

ہر گھر کے سامنے زمین جھاڑ جھوڑ کر صاف کی ہوتی ہے اور گھر کی دہلیز کے سامنے زمین پر کسی سفید آٹے سے بیل بوٹے کھنچے ہوتے ہیں۔ اگر تم صبح سویرے اس گاؤں میں جاؤ تو عورتیں اپنے اپنے گھروں کے آگے یہ بیل بوٹے کھینچتی دکھائی دیں گی اور مرد درانتیاں اور ہل لیے ہوئے کھیتوں کو جاتے ہوں گے۔ گائیں بھینسوں کے گلے اپنی چراگاہوں کی طرف جاتے دکھائی دیں گے۔ گاؤں سے گزرنے پر ہر طرف ہری ہری کھیتیاں پھیلی نظر آئیں گی۔ کھیتوں سے پرے کوئی آدھ میل پر ندی بہتی ہے۔ ندی گاؤں کے تینوں طرف بہتی ہے۔ گاؤں کے پچھلی طرف جانے پر یہ پتہ لگتا ہے کہ یہ ندی کس طرف مڑتی ہے۔ ندی کے موڑ پر یہ مندر والی پہاڑی ہے معلوم ہوتا ہے

یہ پہاڑی کہیں سے بھٹک کر اِدھر آ گئی ہے۔ گاؤں تک جانے کے لیے یا تو بیل گاڑی کے راستے سے جانا پڑتا ہے یا کھیتوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔

میں کئی دفعہ اس پہاڑی پر گیا ہوں۔ گھوڑے کو نیچے کسی درخت سے باندھ دیتا ہوں اور پہاڑی پر چڑھ کر وہاں چند گھنٹے گزارتا ہوں۔ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وقت کیسے گزرتا جا رہا ہے۔ اس چھوٹی سی پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہوں تو آس پاس کا منظر کتنا خوبصورت دِکھائی دیتا ہے۔ یہاں وہاں چھوٹے ٹیلے بکھرے پڑے ہیں اور ان کے بیچ بیچ میں کھیتوں اور زمردیں قلعے، پہاڑی کے دامن میں اور اوپر سایہ دار جھنڈ۔ جگہ جگہ اُونچے اُونچے درخت! کھیتوں میں لوگ کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کی گاؤں پر ایک ایسا امن اور سکون ہے جیسی دھرتی ماتا کی شانتی ہے۔ گائیں بھینسیں اس آزاد زمین پر تازہ گھاس اطمینان سے جی بھر کر کھاتی ہیں۔ ندی بھی اطمینان سے آہستہ آہستہ بہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ندی میں جان ہے جیسے وہ گاؤں کے باشندوں اور گلیوں کی خیریت لیتی ہوئی گاؤں کے اطراف پھرتی ہے۔ درختوں کے جھنڈ میں پرند اس آرام وسکون اور اس چھائی ہوئی مسرّت میں شریک ہوتے ہیں۔ اور ان سب کو سورج کی روشنی اپنی آغوش میں لیے ہوئے ان کا حُسن دوبالا کر رہی ہوتی ہے۔ جب کوئی اس پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا ہوا یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ پہاڑی بھی اس وسیع حُسن کا ایک ٹکڑا ہے اور اس سکون وشانتی کے سمندر میں ڈوبے ہوئے اس پہاڑ پر وہ خود ایک نقطہ ہے۔ اس شانت ساگر میں بہتا ہوا، تو اسے اتنی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ میں نے کئی دفعہ سوچا ہے۔ ''یہ لوگ بہت عقلمند ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آدمی کے دل میں کون سا جذبہ ہے جو مذہبی رُجحان بن جاتا ہے اور اسی بنا پر انھوں نے ایسی جگہوں پر مندر بنائے ہیں جہاں یہ جذبہ تسکین پاتا ہے۔ یہاں کے لوگوں میں حُسن پرستی کا جذبہ بہت قوی ہے۔ پھر میں سوچتا ہوں۔ کیا اس پہاڑ پر آ کر انھیں ان حسین مناظر میں خدا نظر نہ آتا تھا کہ انھوں نے یہ ٹوٹی پھوٹی عمارت کھڑی کر کے اس میں ایک مورتی رکھ دی اور اس پر نظر جما کر خدا خدا پکارنے لگے۔ یہ نہیں جانتے کہ خدا کو کہاں دیکھیں۔ کیا ایسی جگہ میں بھی انھیں مورتی کی طلب ہے؟ اسی طرح اس پہاڑی پر دو ایک گھنٹے گزارنے کے بعد میں کیمپ کو بے دلی

سے لوٹتا ہوں۔ ندی پہاڑ کے قریب آ کر اس کے تینوں طرف بہتی ہے اور ایک طرف کو مڑ جاتی ہے۔ مجھے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ندی اطراف پھر کر یہ دیکھتی ہے کہ اپنی محبوب پہاڑی پر چڑھنے کے لیے کوئی جگہ ہے؟ اور یہ جان کر کہ وہ چڑھ نہیں سکتی، مایوسی سے مڑ جاتی ہے۔ ''کتنی اچھی جگہ کیوں نہ ہو'' ندی گویا کہتی ہے ''یہ میری جگہ نہیں ہے۔ میری منزل مقصود کہیں اور ہی ہے۔''

اسی مندر کے راما پر یہ لوگ ایمان لاتے ہیں۔ کسی نامعلوم وجہ سے یہ مندر خاص انھیں لوگوں کا مانا جاتا ہے اور سال بھر اس کا انتظام انھیں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ صرف پندرہ دن، جب جاترا ہوتا ہے، یہ مندر برہمنوں کو پوجا کے لیے دے دیا جاتا ہے۔ شاید ہم اپنے خدا سے اتنی صفات منسوب کرتے ہیں جیسی کہ یہ وڈر لوگ اپنے دیوتا سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کا خدا مجموعی طور پر ایک اچھا خدا ہے لیکن اگر وہ کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو اس کا قہر غضب کا ہوتا ہے۔ ان لوگوں پر جو سیدھی راہ پر چلتے ہیں وہ حد سے زیادہ مہربان ہے۔ اگر کسی سے گناہ سرزد ہو جائے تو وہ سخت سے سخت سزا دے سکتا ہے۔ اگر وہ کوئی جرمانہ دیں تو وہ اس گناہ کو معاف کر دیتا ہے۔ کوئی آدمی بیمار ہو یا تکلیف میں ہو تو دیوتا سے نیاز کر لیتا ہے کہ یہ بلا ٹل جائے گی۔ وہ دیوتا کے حضور میں فلاں چیز نذر کرے گا۔ بیماری یا تکلیف ضرور رفع ہو جاتی ہے۔ کوئی اپنے ہم مذہب کے ساتھ کتنا ہی پوشیدہ طور پر بُرائی کرے، اگر اسے دیوتا کے سامنے کھڑا کیا جائے تو اس کی زبان سے خود بخود سچ نکل جاتا ہے۔

اس طرح اس مندر کا ''راما'' گویا ان کے لیے گاؤں کے فرائض انجام دیتا ہے۔ انسانی سردار کبھی اپنے فرائض سے بے پروا ہو جائے اور اپنے ارادوں کو بدلے تو بدلے لیکن یہ الوہی سردار اپنے قانون سے بال برابر بھی نہیں ہٹے گا۔

وڈر لوگ اپنے خدا پر اسی قسم کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہی اعتقاد انھیں سیدھے راستہ پر چلاتا ہے۔ اور انھیں بات بات پر عدالت کو جانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ کوئی وڈر آج تک ملزم بن کر کسی عدالت کے سامنے پیش نہیں ہوا، لیکن آج دو وڈر نوجوان عدالت کے سامنے کھڑے تھے کیونکہ مدعی دوسرے مذہب کا آدمی ہے جو انھیں سچا راستہ بتانے کے لیے بہت دُور سے آیا ہے۔

مسٹر ہنری نے مندرجہ ذیل بیان دیا۔ اس حصّہ میں کئی سالوں سے وہ مشنری کا کام کرر ہے ہیں۔ وہ رامابوئی اور تمابوئی کو مدّت سے جانتے ہیں۔ کبھی خصوصاً سالانہ جاترا کے موقعہ پر مسٹر ہنری وعظ دینے رامپور آیا کرتے تھے تو یہ دونو جوان ہمیشہ ہجوم میں موجود رہتے تھے۔ پہلے پہلے چند موقعوں پر دونوں وعظ میں یہ کہہ کر خلل ڈالتے تھے کہ ان کا راما ہنری کے خدا سے بڑا خدا ہے۔ دوسرے وڈر بزرگ اور چند روشن خیال اشخاص انھیں دخل دینے سے روک دیتے تھے۔ پادری صاحب کو اپنے خدا کے متعلق کہنے دو۔ اگر تم میں سے کوئی وعظ نہ سُننا چاہے تو نہ سُنے لیکن اگر کوئی اپنے خدا کی تعریف بیان کرے جیسا کہ وہ اپنے دیوتا کی کرتے ہیں تو انھیں نہ روکنا چاہیے۔ اس پر وہ دونوں خاموش ہو گئے تھے۔ چند دنوں مسٹر ہنری کا وعظ سُننے کے بعد انھوں نے مندر جانا چھوڑ دیا اور کہنے لگے کہ "راما" پر انھیں ایمان نہیں۔ یہ دیکھ کر مسٹر ہنری بہت خوش ہو گئے۔ انھوں نے سوچا کہ اب انھیں آسانی سے اپنے مذہب میں لے سکتے ہیں۔ لیکن یکا یک پانسہ پلٹ گیا۔ ایک دن یہ دونوں مسٹر ہنری کا وعظ سُننے کے لیے بومبگی آئے۔ اور کہا کہ وہ شام کو اپنے گاؤں لوٹ رہے ہیں لیکن وہ گاؤں نہیں گئے۔ وہیں اِدھر اُدھر پھرتے رہے اور رات کو گرجا گھر میں گھس آئے اور وہاں سے چند چاندی کی چیزیں نہرا لے گئے۔ ان میں چند گرجا گھر کی ملکیت تھیں اور چند مسٹر ہنری کی اپنی چیزیں تھیں۔ جو انھوں نے کلیسا میں رکھ چھوڑی تھیں۔ دوسری صبح پادری کو اس چوری کا علم ہوا تو انھوں نے پولیس کو خبر کر دی۔ پولیس نے گھروں کی تلاشی لینی شروع کی۔ رامابوئی اور تمابوئی کے گھروں میں سے بہت سی گم شدہ چیزیں برآمد ہوئیں۔ پولیس نے دونوں کو گرفتار کر کے چارج شیٹ تیار کر دی۔ مسٹر ہنری نہیں چاہتے تھے کہ ان پر مقدمہ چلایا جائے، لیکن معاملہ پولیس کے ہاتھوں دے دیا گیا تھا۔ اب مسٹر ہنری کو اس بارے میں کوئی اختیار نہ تھا۔ علاوہ بریں رامابوئی اور تمابوئی اپنے کیے پر پشیمان نہ تھے۔ مسیح کے بارے میں وعظ سُن کر ابھی تک ان کے دل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے مسٹر ہنری کو خیال ہوا کہ انھیں اس جرم پر چھوٹی سی سزا ملے تو ان کے حق میں اچھا ہو۔ صرف اسی اُمید پر مسٹر ہنری نے عدالت کے سامنے بیان دیا تھا۔

جب مسٹر ہنری یہ بیان دے رہے تھے میں ان دو نوجوانوں کے چہروں کا غور سے مطالعہ کرتا رہا۔ وہ دونوں تراشے ہوئے بتوں کی طرح کھڑے تھے۔ یہ مثل مشرق کے تمام لوگوں پر صادق آتی ہے۔ نہ جانے یہ ان کی لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے ہے یا بہادری کی وجہ سے۔ کیونکہ مکمل لاعلمی یا دلیری ہی انھیں خطرہ کے سامنے خاموش رکھ سکتی ہے۔ انھیں دیکھ کر مجھے سقراط کا خیال آ گیا جو جمے ہوئے قدموں سے موت کے دالان میں آیا تھا۔ یہ بات مجھے نہیں کہنی چاہیے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے اس بزرگ تر اور مکمل تر ہستی، خدا کے بیٹے یسوع مسیح کی اس وقت کی تصویر کھنچ گئی جب وہ روم کے سردار کے سامنے ایک عجب شان سے نڈر کھڑے تھے۔ ان نوجوانوں کا سکون دیکھ کر مجھے ان پر بے حد رحم آ گیا۔ مجھے تعجب ہوا بھلا ان خاموش بے ضرر آدمیوں نے چوری کیوں کی؟

مسٹر ہنری نے اپنا بیان ختم کیا تو میں نے پوچھا۔ ”کیا ان لوگوں نے کہا کہ وہ عیسائی مذہب قبول کر لیں گے؟“

”نہیں“

”پھر تمھیں کیسے خیال ہوا کہ وہ عیسائی بن جائیں گے؟“

”سب سے پہلے انھیں دو نوجوانوں نے اپنے دیوتا پر اعتقاد چھوڑا تھا۔ ان کا عقیدہ سب سے گہرا تھا۔ لیکن سب سے پہلے اس کو چھوڑنے والے بھی وہی تھے۔ یہ ان کی ہر بات سے ظاہر ہوتا تھا۔ چند دوسرے آدمی بھی جنھیں اپنے مذہب پر اعتقاد نہ رہا تھا، برابر مندر جاتے رہے۔ لیکن ان دونوں نے مندر جانا بھی چھوڑ دیا۔“

پھر میں نے راما اور تما کی طرف مڑ کر پوچھا۔ ”اچھا راما بوئی اور تما بوئی تم اپنا وکیل تجویز رکھو گے؟“

راما بوئی نے کہا۔ ”نہیں سرکار وکیل کی کیا ضرورت ہے۔ ہم نے جرم کیا ہے۔ ہمیں کسی وکیل کی ضرورت نہیں۔“

”تمھارے جرم کا اقرار ابھی سے کرنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اسے آگاہ کیا۔ ”تم

اگر چاہو تو پادری صاحب کے بیان کو جھٹلا سکتے ہو اور ثابت کر سکتے ہو کہ یہ ٹھیک نہیں۔"

"سرکار" رامابوئی نے کہا "پادری صاحب جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔اور ہم بھی یہ جرم کرنے کے بعد بچ نکلنا نہیں چاہتے۔اس سے کیا فائدہ؟ آپ جانتے ہیں حضور ایسا کرنا بُرا ہے۔"

"صرف تمھاری بات کرو" میں نے کہا "جرم کا اقبال کرتے ہوئے اپنے ساتھی کو بھی اس میں نہ ملاؤ۔"

تمابوئی نے کہا "میں بھی یہی کہتا ہوں حضور، ہم دونوں نے مل کر چوری کی۔"

میں نے کہا "ذرا ٹھہرو۔ میں تمھارا بیان لکھے لیتا ہوں۔ پھر تمھیں پڑھ کر سناؤں گا۔"

میں نے چارج لکھ کر انھیں پڑھ سُنایا۔اور پوچھا وہ اقبالِ جرم کرتے ہیں یا نہیں، انھوں نے اپنا جرم تسلیم کر لیا۔ میں نے یہ اقرار بھی لکھ لیا اور پوچھا "رامابوئی تم دونوں تو عیسائی بننا چاہتے تھے۔تم نے چوری کیوں کی؟"

رامابوئی نے کہا "ہم ہمارا دھرم چھوڑنا نہیں چاہتے حضور۔"

"لوگ کہتے ہیں تم نے تمھارے دیوتا کو چھوڑ دیا تھا۔"

"ہاں حضور" رامابوئی نے کہا "پادری صاحب نے کہا تمھارے خدا کو دیکھو، اگر تم دِیا نہ جلاؤ تو وہ اندھیرے ہی میں بیٹھا رہتا ہے۔اس کی کوٹھی صاف نہ کرو تو دھول میں بیٹھا رہتا ہے۔ اس میں اتنی بھی قدرت نہیں کہ اپنی کوٹھی صاف کر کے اس میں روشنی کرے۔ہم پادری صاحب کی بات آزمانا چاہتے تھے۔ بڑے بوڑھوں نے ہمیں اس سے روکا لیکن ہم نے ہٹ کر کے زبردستی مندر کا دروازہ بند کر ڈالا۔ دس دنوں تک ہم نے دروازہ بند رکھا۔ پھر اندر جا کر دیکھا۔ بالکل وہی حالت تھی جیسا پادری نے کہا تھا۔مورتی پہ کچھ مٹی پڑ گئی تھی۔ دیوتا نے اپنے جسم پر سے مٹی تک نہیں جھاڑی تھی۔ہم نے مندر جانا چھوڑ دیا۔اور ایک دن وہاں مندر سے چند برتن چرا لیے، اس پر بھی کوئی عذاب نہ اُترا۔ جب ہم جان گئے کہ مندر کا خدا کوئی قوت نہیں رکھتا۔"

"اگر اُس مندر کا خدا بے بس تھا تو تم نے اس گرجا گھر میں چوری کیوں کی؟"

"اس مندر میں تو حضور کوئی خدا ہی نہیں ہے۔جس مندر میں خدا ہے اس میں ڈرنے کی

کوئی بات نہیں تو اس مندر میں ڈر کی کیا بات ہے جس میں خدا ہی نہیں۔ یہ سوچ کر میں اور تمابوئی اتوار کی رات گرجا گھر میں گھس کر چند چیزیں چرا لائے۔"

''اب دیکھو خدا تمھیں سزا دے رہا ہے نا!''

''نہیں حضور۔ پادری نے ہمارے خلاف دعویٰ دائر کیا۔ خدا کیا کر سکتا تھا۔ اُس خدا میں بھی کچھ نہیں اِس خدا میں بھی کچھ نہیں۔ پادری صاحب کلیسا کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہمارے قبیلہ کا سردار مندر کی چیزوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ آپ اس جرم کی جو سزا دیں گے بھگتنے کے بعد، اس مندر کو نقصان پہنچانے کے جرم میں ہمیں قبیلہ کو بھی جرمانہ دینا پڑے گا، ہماری برادری نے یہی فیصلہ کیا ہے۔''

میں نے مڑ کر مسٹر ہنری سے پوچھا ''شاید راما پر ان کا اعتقاد کمزور کرنے کے لیے تم نے یہ دلیل پیش کی ہوگی۔''

''ہاں'' ہنری نے جواب دیا۔ ''میں ان پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ مورتی خدا نہیں ہے۔ چند نوجوانوں نے میری بات آزمانے کے لیے مندر کا دروازہ بند کر دیا۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ انھوں نے وہاں سے برتن بھی چرائے ہیں۔ مجھے یہ خیال تک نہ گزرا کہ وہ اس نکتہ پر اس طرح بحث کر کے ہماری کلیسا میں بھی چوری کریں گے۔''

میں نے تمابوئی اور راما بوئی سے کہا کہ ''وہ ایک چھوٹا سا جرمانہ ادا کر کے جا سکتے ہیں۔''

''نہیں حضور ہم نقدی نہیں دے سکتے'' وہ بولے ''غریب آدمی ہیں حضور۔ ہمارے دیوتا کو بھی جرمانہ دینا ہے۔ وہ بھی مشکل سے ہو سکے گا۔ ہم یہاں پیسے نہیں دے سکتے۔''

''تو مجھے مجبوراً قید کی سزا دینی ہوگی۔ چونکہ تم لوگوں نے جاہلی سے یہ کام کیا ہے اس لیے معمولی قید کی سزا دیتا ہوں۔''

''لیکن حضور'' تمابوئی نے کہا۔ ''ہم سے ایک جگہ بیکار نہیں بیٹھا جاتا۔ سخت قید کی سزا دیجیے کہ کچھ محنت کرنا پڑے۔ یوں ہم آسانی سے وقت گزار سکیں گے۔''

میں نے بہت سوچنے کے بعد نہایت افسوس کے ساتھ ہر ایک کو پندرہ روز قیدِ بامشقت

کی سزا دی۔ فیصلہ سُنانے کے بعد میں نے مسٹر ہنری سے پوچھا۔ ''مسٹر ہنری! تم نے ان لوگوں کو وہ جگہ کیوں بتائی جہاں گرجا میں چاندی کا سامان رکھا جاتا تھا؟''

مسٹر ہنری نے جواب دیا ''میں ایک دن انھیں گرجا گھر لے گیا اور انھیں خوش کرنے کے لیے ہمارے چاندی کی برتنوں کا خوبصورت نقش ونگار بتایا۔ وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس لیے جب کبھی وہ آتے تھے انھیں خوش کرنے کے لیے چیزیں دِکھایا کرتا تھا تاکہ کسی وجہ سے بھی ہو وہ گرجا گھر آئیں اور خدا کا کلام سُنیں۔ اب دیکھتا ہوں کہ اس کا نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔''

ہاں اس کا نتیجہ یقیناً بُرا نکلا تھا۔ میں نے ان وڈر جوانوں کو سزا تو دے دی۔ اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ اس جرم کی آدھی ذمہ داری مسٹر ہنری پر بھی عاید ہوتی ہے۔

مجھے یہ ماننا پڑتا ہے کہ آج میرے دل کا چین اُڑ گیا ہے۔ زندگی کے حادثات کا خیال کر کے ایک آدمی نیم تاریکی میں چلتا ہوا بھٹک کر غلط راستہ پر چلتا ہے۔ دوسرا آدمی آ کر اُسے اُجالا دِکھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اپنے ارادے کے خلاف، غیر ارادی طور پر اسے ایک گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔ ایک تیسرا آدمی آتا ہے اور اس گرے ہوئے آدمی کو چھڑی سے پیٹنا شروع کر دیتا ہے کہ وہ کیوں گرا؟ یہ سب کیسی بے وقوفی ہے!

ہاں بے شک یہ سب دیوانگی ہے لیکن ایک وہ بھی ہے جو سب کچھ جانتا ہے، جو سب سے بڑا ہے، اسی کے ہاتھ میں آخری اور ابدی فیصلہ ہے۔ ہم صرف یہاں انصاف کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارا یہاں کا انصاف ہے۔

ایک پُرانی کہانی

(ماستی وِنکٹیش آئینگار)

شام ہو چلی تھی۔ شام، جو گہری ہو کر پونم کی رات بننے والی تھی۔ سورج کسی شریر لڑکے کی طرح دن بھر بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے تھک کر اب سونے جا رہا تھا اور بدلیاں سارے آکاش پر یوں بکھر گئی تھیں جیسے کسی پیچھا کرنے والے سے سہم کر اِدھر اُدھر بھاگ رہی ہوں اور چھپنے کی کوشش میں ناکام ہو کر گھبرائی گھبرائی اِدھر اُدھر بکھر گئی ہوں۔ اور ہوا بھی خاموش تھی۔ اس گڈریے لڑکے کی طرح جس کی بھیڑ بکریاں بھاگ نکلی ہوں اور وہ ان کا پیچھا کرتے کرتے تھک کر خاموش ہو گیا ہو۔ ہوا اب ندی کے کنارے بڑے بڑے درختوں کے درمیان آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔

سورج کو گویا یاد آ گیا کہ اب دن ختم ہو رہا ہے۔ اور آج کے دن ساری دُنیا میں جو کچھ ہوا تھا وہ اِس کا عینی شاہد ہے اور اس حیثیت میں اس کا اپنا ایک فرض ہے ڈُوبنے سے پہلے اس نے اپنی شعاعیں ساری دھرتی پر پھیلا دیں آکاش پر شفق کی لالی چھا گئی، ساری کائنات حسین ہو گئی۔

ندی کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں سکڑوں کی موسیقی کی طرح مدھم سُر نکل رہے تھے۔ ندی کا پانی جو اپنے بچپن میں (یعنی ندی کے منبع سے) شوخی سے چھوٹے بڑے پتھروں سے کھیلتا آیا تھا، اب سنجیدگی اور گھمبیرتا لیے ہوئے تھا۔ اب اس کے سر میں منزل کی دُھن سمائی ہوئی تھی۔ وہ اپنی منزل یعنی سمندر تک پہنچنا اور اس میں اپنے آپ کو کھو دینا چاہتا تھا، لیکن ایک جوان عورت کی طرح سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ساتھ اس میں شوخی ابھی باقی تھی۔ چلتے چلتے وہ کبھی چکر میں گھوم جاتا، کبھی ناچ اُٹھتا اور میٹھی آواز میں گنگناتا جاتا جیسے کوئی عورت اپنے گھر کا کام کاج کرتے ہوئے میٹھے سُروں میں گنگناتی جائے۔ ڈُوبتے سورج کی کرنیں ندی کے پانی سے کھیل

رہی تھیں، درختوں کے جھنڈ پر پڑ رہی تھیں، پاس کے گاؤں پر پڑ رہی تھیں، گایوں بھینسوں کے گلوں پر، اور ننھے ننھے بچھڑوں پر جو اپنی ماؤں کو پکار رہے تھے اور چراگاہوں سے اب گاؤں واپس آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا، سورج کی کرنوں کو دھرتی کی اِن ساری چیزوں سے پیار ہو گیا ہے اور وہ اِس حُسن کو تحسین بھری نظروں سے دیکھ رہی ہیں جو اُن کے چھونے سے دھرتی کی اُن چیزوں پر نکھر آیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کرنیں یہاں سے لوٹنا نہیں چاہتی ہیں اور اس کشمکش میں تھرتھرا رہی ہیں۔

ساری کائنات پر امن و سکون چھایا ہوا تھا۔ ندی کے کنارے، اپنے مٹھ کے سامنے، گھاس کی چوکی پر، ایک سنیاسی بیٹھا شام کے اس حُسن کے نظارے میں محو تھا اور شام کے اس امن و سکون کو اپنی رُوح میں جذب کر رہا تھا۔ اس کا سِن کچھ زیادہ نہیں تھا۔ چالیس کے لگ بھگ ہوگا۔ اس کے نورانی چہرے پر راکھ ملی ہوئی تھی اور اس کے راکھ ملے ہوئے چہرے کا نور سامنے رکھی ہوئی انگیٹھی میں پڑے ہوئے ان انگاروں سے مشابہ تھا، جن پر راکھ کی ہلکی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اپنے تن پر وہ ایک سنیاسیوں کے عام دستور کے مطابق گیروے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔

ادھیڑ عمر کے اس سنیاسی کی شخصیت میں ایک عجیب آن بان اور عظمت تھی۔ وہ ایک قدیم، وضع دار اور علم و فضل سے بہرہ ور خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ اور ابھی لڑکا ہی تھا کہ اس مٹھ کا سوامی اسے یہاں لے آیا اور اس وقت سے اس کی پرورش اور تربیت اس ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے گُرو کا سب سے محبوب چیلا تھا۔ گُرو نے اسے اپنی جانشینی کے لیے منتخب کیا تھا اور اس لیے اسے خاص تربیت دی تھی۔ ضبطِ نفس اور رُوحانی ارتقا کے وہ سارے قواعد جو اس ادارے سے نسلاً بعد نسلاً وابستہ چلے آئے تھے، اُسے سکھائے گئے تھے۔ اپنے اُستاد کی موت کے بعد اب وہ اس مٹھ کا سربراہ بن گیا تھا۔ اس کا اُستاد اور گُرو بہت پہنچا ہوا گورو تھا اور وہ اپنے اُستاد کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ اس کی صرف ایک تمنا تھی وہ اپنے اُستاد کی جانشینی کا صحیح معنوں میں حقدار ثابت ہو اور اس کے تحت اس ادارے کی شہرت اور نیک نامی پر خراش بھی نہ آنے پائے۔ لگاتار کوشش سے اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس نے رُوحانی ارتقا کے کئی مدارج طے کر لیے تھے اور اب ایک بے داغ اور باقاعدہ زندگی بسر کرنے کا پھل پا رہا تھا۔ اس کی رُوح کو ایک سکون حاصل

تھا اور اس کی رُوح کا یہ امن و سکون شام کے امن و سکون کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ یہ ہم آہنگی اس کے دل کو ایسی بے پایاں مسرت بخش رہی تھی کہ کوئی اور دل، جو اتنا پاکیزہ نہ ہو، یہ مسرت اور اطمینانِ قلب پا ہی نہیں سکتا تھا۔

اس کا ایک چیلا مٹھ سے باہر آیا اور کہنے لگا ''گورو جی، حسبِ ارشاد میں نے ساری نقلوں میں ترمیم کر دی ہے۔''

سنیاسی نے کہا ''بہت اچھا۔ شکریہ''

اور سنیاسی کو جواب تک اپنے کو فطرت سے یک جان محسوس کر رہا تھا اور قدرت کے نظاروں میں محو تھا، ایک خیال پھر ستانے لگا۔ آج صبح بھی اس خیال نے اسے پریشان کیا تھا۔ سنیاسی کا یہ معمول نہ تھا کہ اپنی روز کی کارکردگی کا جائزہ لے۔ ہر روز جو کچھ بھی وہ کرتا تھا، یہ پہلے ہی سے مقرر شدہ تھا۔ وہ اپنی طرف سے گویا کچھ بھی نہ کرتا تھا۔ اس مٹھ میں صدیوں سے جو دستور چلا آیا تھا، اس کے روز و شب اسی دستور کے مطابق گزر رہے تھے۔

لیکن آج ایک غیر معمولی بات ہوئی تھی۔ آج بھی حسبِ معمول اس نے سب سے پہلے مٹھ کی بڑی دیوی کی پوجا کی، پھر حسبِ معمول وہی ہلکی غذا کھائی، پھر اپنے شاگردوں کو پڑھایا۔ اس کے بعد اپنے ایک خاص شاگرد کو جو دوسروں سے بہت آگے تھا، سبق دینے لگا۔ اس لڑکے کا نام شیشا تھا۔ شیشا اس کا سب سے محبوب چیلا تھا۔ جس طرح وہ خود اپنے گورو کا سب سے محبوب چیلا تھا۔ شیشا کو اس نے بڑی احتیاط سے منتخب کیا تھا اور اپنی جانشینی کے لیے بڑی کاوش سے اُسے تربیت دے رہا تھا۔ شیشا ایک کتاب لے کر پڑھنے لگا۔ وہ کتاب کے چند جملے پڑھتا پھر اس کی تفسیر کرتا۔ درمیان میں کوئی دقیق مسئلہ نکل آتا تو اپنے اُستاد سے پوچھ لیتا۔ یا کبھی اس کی ضرورت محسوس ہوتی تو اُستاد خود ہی مزید تشریح و تفسیر کر دیتا۔ جب شیشا پڑھتے پڑھتے اس جملے پر پہنچا ''مرد خواہ کتنا ہی سن رسیدہ، کتنا ہی دانشور، کیسا ہی پرہیزگار کیوں نہ ہو، حسیاتی لذّتوں کی طرف کھنچ ہی جاتا ہے'' یہاں مراد خاص طور پر ان حسیاتی لذّتوں سے تھی جو عورت کی ترغیب اور کشش سے وابستہ ہیں۔

یہ جملہ سُن کر سنیاسی نے کہا ''مجھے بار ہا خیال آیا ہے کہ یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ ایک سچے پرہیز گار سنیاسی کو عورت کی ترغیب سے خوف محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بیان ویاس کا ہے اور ویاس نے یہ بیان دیتے ہوئے، غالباً خود اپنا خیال کیا ہوگا۔ اس بیان میں یوں ترمیم کر دو کہ ''کتنا ہی سن رسیدہ، کیسا ہی عقلمند کیوں نہ ہو، مرد حسیاتی لذتوں کی طرف کھنچ ہی جاتا ہے، لیکن ایک سچے سنیاسی کو یہ لذتیں اپنی طرف کھینچ نہیں سکتیں۔'' چیلے نے عرض کیا ''حضور یہ ویاس کا بیان ہے۔ اسے یوں ہی رہنے دیا جائے۔''

سنیاسی نے کہا ''ویاس کی عظمت مسلّم ہے لیکن تارک الدنیا سنیاسیوں کے بارے میں اس کا بیان حرفِ آخر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ خود سنیاسی نہیں تھا۔ اگر کسی سنیاسی نے، مثلاً شکھا نے یہ بات کہی ہوتی تو پھر اسے بدلنے میں ہمیں جھجک ہونی چاہیے تھے۔ میں نے جیسے بتایا ہے، ویسے تصحیح کر دو۔''

شیشا نے اپنے اُستاد کے حکم کی تعمیل کیا۔ پھر سنیاسی نے اس سے کہا کہ مٹھ کے کتب خانہ سے اُس کی دوسری سب نقلیں نکال کر ان میں یہی ترمیم کر دے۔ یہی بات تھی جس کا سنیاسی سے شیشا اب ذکر کر رہا تھا کہ اس نے ساری نقلوں میں ترمیم کر دی ہے۔

شیشا کو پڑھا چکنے کے بعد سنیاسی سے شیشا اب ذکر کر رہا تھا، کہ اس نے ساری نقلوں میں ترمیم کر دی ہے۔ شیشا کو پڑھا چکنے کے بعد سنیاسی مٹھ سے باہر نکل آیا اور اس مسئلہ پر کافی غور و خوض کرتا رہا، آیا وہ اس بیان کی ترمیم میں حق بجانب تھا یا نہیں؟ آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس نے ٹھیک قدم اُٹھایا تھا۔ اب شیشا کے یاد دلانے پر دوبارہ اس نے اس مسئلہ پر خوب سوچ بچار کی اور پھر اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس نے جو کچھ کیا ٹھیک ہی تھا۔

اس کے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اسے پورا اعتماد تھا۔ اس کے علاوہ اپنے اُستاد کی بے داغ زندگی کی مثال بھی اس کے سامنے تھی۔ اُسے یاد آیا کہ جب اپنے اُستاد کے سامنے وہ یہی سبق پڑھ رہا تھا تو یہ جملے پڑھتے ہوئے اسے شرم محسوس ہوئی تھی اور اس نے اپنی آواز نیچی کر لی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اُستاد اس کی ضرور تشریح کرے گا۔ اور وہ پڑھتے پڑھتے رُک گیا تھا۔ لیکن اس کے اُستاد

نے کوئی تشریح نہ کی اور اس سے آگے پڑھنے کے لیے کہا۔ وہ آگے پڑھنے لگا اور جب سبق ختم ہو گیا تو اس نے خود ہی اپنے اُستاد سے پوچھا کہ ویاس نے یہ بات کیوں کہی تھی۔ اُستاد نے جواب دیا ''اس بیان میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ ہم عموماً عورت کو مرد سے کمتر خیال کرتے ہیں۔ لیکن دراصل عورت کی رُوح مرد کی بہ نسبت ''تکمیل'' اور ''ارتقا'' سے قریب تر ہے۔ جو کچھ کمتر ہے وہ برتر کی طرف کھینچتا ہے۔ یہی چیز ہے جسے کشش کا نام دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ لوہا کتنا صاف کیوں نہ ہو، مقناطیس کی طرف کھینچتا ہے۔ مرد بھی اسی طرح عورت کی کشش سے کھنچتا ہے۔ کشش محسوس کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ گناہ کی طرف مائل ہے۔ وہ اپنے جذبات اور احساسات کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ یہ جملے ازراہِ احتیاط لکھے گئے ہیں۔'' اُستاد کی اس تشریح سے اس کی ذہنی تسکین تو ہو گئی تھی لیکن دل کو اطمینان نہ ہوا تھا۔ اسے اپنے اُستاد پر بے حد ناز تھا۔ اس تشریح سے صاف ظاہر تھا کہ اُستاد نے خود عورت کے حُسن میں کوئی خطرہ محسوس نہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی خود اُستاد کی زندگی اس کی شاہد تھی۔ وہ زندگی جو پاک اور بے داغ تھی، صاف نیلے آسمان کی طرح نکھری ہوئی، ندی کے شفاف پانی کی طرح۔

اُستاد کی رُوح کو جسدِ خاکی کو چھوڑے ہوئے کئی سال ہو گئے۔ اس کے بعد اس نے یہ جگہ سنبھال لی تھی۔ اس وقت سے اب تک ویاس کے اس بیان کو اس نے بار بار پڑھا تھا۔ اور ہر بار اسے اس کی مکمل صداقت میں گمان ہوا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں آج تک کبھی ایسے تجربہ سے نہیں گزرا تھا۔ اس کی زندگی میں آج تک ایک بھی ایسا موقعہ نہیں آیا تھا، جس میں عورت کے حُسن نے اسے اپنی طرف کھینچا ہو۔ لڑکپن سے اب تک اس نے بیسیوں عورتوں کو دیکھا تھا سب سے پہلی عورت تو اس کی ماں تھی۔ اس کی ماں کا چہرہ، کیا حُسن تھا، اُس حُسن میں کیا متانت تھی، کیسا سکون تھا! یہی کامل حُسن اور کامل سکون اس نے دیوی کی مورتی میں بھی دیکھا تھا۔ جس کی وہ ہر روز پرستش کرتا تھا۔ اس کی ماں حسین عورت تھی۔ اس کی بہنیں بھی بڑی حسین و جمیل لڑکیاں تھیں۔ یہ لڑکیاں بڑی ہو کر خوب صورت عورتیں بنیں، بیویاں اور مائیں بنیں، انھوں نے اپنے گھر بسائے، زندگی بنائی اور ایشور کو پیاری ہوئیں۔ اس نے اپنی بہنوں کا حُسن بھی دیکھا تھا۔ جب وہ ابھی نوجوان تھا۔ اور

ایک بڑا شہر دیکھنے گیا ہوا تھا، تو وہاں اس کے بعض عقیدت مندوں نے اس کا جلوس نکالا تھا۔ انھوں نے اس موقع پر طوائفوں کو بھی بلوایا تھا جو جلوس کے آگے آگے رقص کرتی جارہی تھیں۔ ان ناچنے والی لڑکیوں نے اسے بھی انھیں نظروں سے دیکھا تھا جیسے وہ اور مردوں کو دیکھنے کی عادی تھیں۔ اور انھوں نے اس کے سامنے بھی اپنی ساری کافر اداؤں، رعنائیوں، غمزوں، عشوؤں کا مظاہرہ کیا تھا۔ لیکن وہ ان کے حُسن اور رعنائی کے سحر سے اسی طرح بیگانہ اور بے پرواہ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے منع کر دیا تھا کہ اس کے جلوس میں ناچنے والی عورتیں شامل نہ ہوں۔

بارہا ایسا ہوا تھا کہ جب وہ ندی کے کنارے چہل قدمی کر رہا ہوتا، گاؤں کی عورتیں وہاں نہا رہی ہوتیں۔ یہ عورتیں بھی ایسی ہی خوبصورت تھیں جیسے اس کی ماں بہنیں خوب صورت تھیں۔ نہاتے نہاتے جب اُن کی نظر سنیاسی پر پڑ جاتی تو وہ گھبرا کر اپنا بدن ڈھانپ لیتیں یا اور گہرے پانی میں چلی جاتیں۔ اور اس کے سامنے شرم وحیا سے سر جھکا لیتیں۔ انھیں دیکھ کر سنیاسی دوسری طرف منہ پھیر لیتا۔ نہاتی ہوئی، نیم عریاں عورتوں کا حُسن بھی اس میں للچاہٹ پیدا نہ کر پاتا اور اس کا دل ویسے ہی صاف اور پاکیزہ رہتا۔ بلکہ کبھی کبھی وہ یہاں تک سوچتا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر ایسے میں گوپی کرشنا، ان عورتوں کی ساڑیاں اُٹھا لے جائے، یہ تو خواہ مخواہ اس کے سامنے جھینپتی ہیں۔

یہاں ہمیں ایک بات سمجھنا چاہیے، یہ بات نہ تھی کہ سنیاسی حُسن کے احساس سے بالکل ہی عاری تھا لیکن حُسن کو دیکھ کر اس کے دل میں اپنا لینے کی للچاہٹ کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ حُسن کا اسے احساس تھا، طلب نہ تھی۔ عورت کے خوبصورت پیکر کو دیکھنے سے اسے مسرّت ہوتی تھی مگر یہ مسرّت ایسی ہی تھی۔ جیسے حُسن کو کسی بھی شکل میں دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ حُسن کو دیکھ کر سنیاسی اپنے آپ سے کہتا "حُسن خدا کی تخلیق ہے۔ زندگی کی تجدید کے لیے خدا نے حُسن کو پیدا کیا ہے۔ وہ کسی جوان، اچھی پلی ہوئی خوبصورت گائے کو دیکھتا۔۔۔ بھرا بھرا جسم، بڑی بڑی آنکھیں، چھوٹے چھوٹے حساس، لرزتے ہوئے کان، سر پر اُگے ہوئے خوبصورت سینگ۔۔۔ تو اس گائے کو دیکھنے سے بھی اُسے اسی نوع کی خوشی محسوس ہوتی جیسے کسی جوان خوبصورت عورت کو دیکھنے سے۔

اپنے بعض خوشحال عقیدت مندوں کے گھروں میں اس نے خوبصورت عورتوں کے

جھرمٹ کے جھرمٹ دیکھے تھے۔ یہ عورتیں اس سے آشیرواد لینے کے لیے جمع ہوئی تھیں۔ عموماً تہوار کے موقعے ہوتے۔ اور یہ عورتیں خوب بنی ٹھنی ہوتیں، زرق برق کپڑے پہنے، زیورات سے لدی پھندی۔ ایک بڑے مجمع میں گھری ہوئی، اور اس احساس سے کہ مرد انھیں گھور رہے ہیں، شرمائی، لجائی، سمٹی، سمٹائی، وہ آشیرواد لینے کے لیے اس کے قریب آتیں۔ حُسن کے احساس کے ساتھ یہ شرم و حیا ان کے حُسن میں چار چاند لگا دیتی۔ ان کی آنکھوں کی چمک کے آگے ان کے کندنی زیوروں کی چمک بھی ماند تھی۔ یہ خوبصورت عورتیں اس کے پاؤں پر جھکی جاتی تھیں۔ اس کے یہ پاؤں خوبصورت نہ تھے۔ یہ پاؤں گندمی رنگ کے عام پاؤں تھے جو ریاضت سے سُوکھ کر پتلے ہو گئے تھے۔ جب سنیاسی ان خوبصورت چہروں کو اپنے پاؤں پر جھکے ہوئے دیکھتا تو اسے اپنے مٹھ کے پاس والے تالاب کا خیال آتا جس میں سُوکھی ٹہنیوں کے پاس خوبصورت کنول تیرتے ہیں۔

حُسن کا یہ تنوع، یہ رنگارنگی، یہ رعنائی، یہ کشش۔۔۔ اس کی نظر نے سب کچھ دیکھا تھا۔ لیکن اس کا ذہن کبھی نہیں بھٹکا تھا۔ ہر روز وہ اپنی دیوی کی مورتی کے سامنے بیٹھے یہ سوچتا، اس شبیہہ کو ڈھالنے والا، ان خدوخال کو تناسب دینے والا واقعی کوئی ایسا فن کار ہی ہوسکتا ہے جس نے تخلیق کے حُسن کا صحیح تصوّر کیا ہو۔ جسمانی اور حسیاتی طور پر اس حُسن کو محسوس کیا ہو اور پھر وہ دیوی کے حُسن کے تصوّر میں کھو جاتا، جیسے آج شام وہ فطرت کے حُسن کے تصوّر میں کھو گیا تھا۔ جس کی رُوح ایسی پاک ہو جو دیوی کے حُسن کے تصوّر میں اس طرح محو ہوسکتا ہو، اس دُنیا کی کسی عام عورت کا حُسن اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا؟ اور اسی لیے ویاس کا یہ بیان پڑھ کر اُسے بڑی تکلیف ہوئی تھی۔ اگر وہ اس بیان میں تھوڑی سی مناسب ترمیم کردے تو ہرج کیا تھا؟ جب کہ اس نے اپنے ذاتی تجربہ میں، کبھی ایسی کمزوری محسوس نہیں کی تھی۔ تو یہ ترمیم کرنے میں وہ بالکل حق بجانب تھا۔ ممکن ہے اس میں تھوڑی سی خود پسندی بھی شامل ہو، لیکن اگر آدمی اتنا نیک ہو تو پھر اتنی خود پسندی تو اس کے لیے جائز ہے؟

ویاس نے متاہلانہ زندگی کی لذت چکھی تھی۔ اس لیے اس کا عورت سے وابستہ جسمانی

لذتوں کی طرف کھنچنے کا امکان تھا آخر وہ ان کے بارے میں قطعی حکم کیسے لگا سکتا تھا۔ جنھوں نے دُنیا تیاگ دی تھی، اور عورت کو کبھی نہ جانا تھا۔

یہ سب سوچ کر سنیاسی میں اتنی خود اعتمادی پیدا ہو گئی کہ اس نے سورج کی تیز کرنوں سے جو اس کے وجود کے آر پار ہو کر اس کی سچائی کا امتحان لینا چاہتی تھیں، مسکرا کر نظریں ملائیں۔ گویا انھیں آزمانے کی دعوت دے رہا ہو۔

اپنا امتحان لیتے ہوئے سنیاسی نے چند اہم اُمور کو نظر انداز کر دیا تھا۔ جب ہمیں کسی چیز سے خوشی حاصل ہوتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس میں کشش محسوس کرتے ہیں۔ خارجی طور پر وہی کشش ہے۔ جب وہ ندی کے کنارے نہاتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھے بغیر گزر جاتا تھا تو کیا اس کی پاکیزگی میں یہ تمنا شامل نہ تھی کہ یہ عورتیں اِسے اچھا سمجھیں؟ جب وہ اپنے شاگردوں کے کمروں میں خوبصورت عورتوں کے مجمع میں کھڑا ہوتا تھا تو کیا واقعی یہ بات تھی کہ اس کے دل میں انھیں ایک سے دوبارہ دیکھنے کی آرزو نہیں پیدا ہوتی تھی یا وہ محض اپنے ضبطِ نفس کا اس لیے مظاہرہ کرتا تھا کہ لوگ اِسے اچھا سمجھیں؟ اور اس کے زہد و تقویٰ سے متاثر ہوں۔

سنیاسی نے ان سب باتوں کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ وہ اس سے آگاہ تھا کہ اسے حُسن سے مسرّت حاصل ہوتی ہے۔ اگر پاکباز سمجھے جانے کی تمنا درمیان میں حائل نہ ہوتی تو وہ کسی طلب سے اپنے ارادہ کو آلودہ کیے بغیر حُسن کو دیکھ سکتا تھا اور وہ اس حُسن پر اسی طرح غور کر سکتا تھا، جیسے وہ دیوی کے حُسن کے تصوّر میں محو ہوتا تھا۔

شام گہری ہو گئی۔ ساری چڑیاں ندی کے کنارے جھنڈ پر جمع ہو گئیں اور اپنے اپنے راگ گانے لگیں، گویا سب نے مل کر ایک حسین ''سمفونی'' چھیڑ دی۔ پھر وہ اُڑ کر اپنے اپنے گھونسلوں میں چلی گئیں۔ تاریکی نے سارے گاؤں کو اس طرح ڈھانپ لیا جیسے رات، دھرتی کی ماں، اپنے بچّے کو تھپک تھپک کر سُلاتے ہوئے اپنی ساری کے آنچل سے اُسے ڈھانپ دے۔

دُور گاؤں میں ایک ایک کر کے چراغ جل اُٹھے اور یہ ننھے ننھے دِیے دُور سے درختوں کے درمیان ٹمٹما رہے تھے۔ ایک گائے جو دیر سے گاؤں واپس آئی تھی اپنے بچھڑے کو پکار رہی

تھی۔ جب شام گہری ہوگئی اور ہر سو خاموشی چھا گئی ندی کے بہتے ہوئے پانی کا مدھم سا شور مٹھ میں سُنائی دینے لگا۔ سنیاسی وہیں باہر بیٹھا رہا اور شام کے اس سکون سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

پھر ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ اچانک، کہیں قریب سے، سنیاسی کے کانوں میں، پائل کی جھنکار سُنائی دی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی عورت مٹھ کی جانب تیزی سے چلی آ رہی ہے۔ سنیاسی نے ادھر مڑ کر دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ بھلا اس وقت کون آئے گا؟ مٹھ کو آنے والے دن میں آتے تھے۔ مٹھ کا راستہ ایک گھنے جنگل میں سے ہو کر نکلتا تھا اور قریب ایک پہاڑی تھی جہاں چیتے رہتے تھے۔ اندھیرا ہونے کے بعد لوگ اِدھر سے گزرتے ڈرتے تھے۔ اگر کوئی شام سے پہلے مٹھ واپس نہ آ سکتا تو وہ گاؤں واپس چلا جاتا۔ آج کیا بات ہے کہ کوئی اس وقت مٹھ کی طرف آ رہا ہے؟ اور پھر ایک عورت؟ ممکن ہے کوئی عورت گاؤں جاتے ہوئے راستہ بھول گئی ہو۔

پائل کی جھنکار نزدیک آتی گئی اور پھر ایک جوان عورت مٹھ کے دروازے پر کھڑی پوچھ رہی تھی۔

''ماں، اس گھر میں کوئی ہے؟''

اب رات گہری ہوگئی تھی۔ سنیاسی بات کرنے والی کی شکل اچھی طرح دیکھ نہیں سکتا تھا۔ انگیٹھی سے جو تھوڑی سی روشنی نکل رہی تھی، اس عورت پر پڑ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا عورت کافی دیر سے بارش میں بھیگتی چلی آ رہی ہے۔ اس کے کپڑے گیلے ہو رہے تھے، اور بدن سے چمٹ گئے تھے۔

سنیاسی نے پوچھا ''آپ کون ہیں؟''

''یہ کس کا گھر ہے؟ آپ کا ہے؟'' عورت نے سوال کیا۔

''یہ ایشور کا گھر ہے، ماں جی، مٹھ ہے'' ۔۔۔ ''کیا مٹھ میں عورتیں بھی ہیں؟''

''نہیں ماں جی۔ کیوں؟ تم یہاں کیسے آئی ہو؟''

عورت سنیاسی کے قریب آ گئی اور اس کے گیروے کپڑے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''کیا آپ اس مٹھ کے سوامی ہیں؟''

''ہاں، ماں جی۔''

''بابا، میں بہت خوفزدہ ہوں۔ جب آپ نے کہا، مٹھ میں تو عورتیں نہیں ہیں تو میں بہت گھبرا گئی۔ پھر آپ کو دیکھنے سے مجھے تسلّی ہوئی۔ آپ میرے باپ کے برابر ہیں، کیونکہ آپ سنیاسی ہیں۔ اگر میں یہاں ٹھہروں تو کوئی بھی میرے چال چلن پر شبہ نہیں کر سکتا لیکن بابا، مجھے نہیں معلوم میرے پتی کا کیا ہوا ہے۔ میں اب کیا کروں، کہاں جاؤں؟'' اور عورت رونے لگی۔

سنیاسی کا ذہن مضطرب ہو گیا۔ اُسے عورت پر رحم آنے لگا۔

''آپ کے پتی کے کچھ ہو جانے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ کیا آپ اپنے پتی کے ساتھ آئی تھیں؟ آپ کہاں سے آ رہی ہیں؟'' سنیاسی نے عورت سے دریافت کیا۔

جہاں سنیاسی کا دل عورت کی مصیبت سے مضطرب ہو گیا تھا، وہاں اُسے ایک طرح کی خوشی بھی تھی کہ یہ ثابت کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا ہے کہ وہ عورت کے جسم میں کوئی کشش نہیں محسوس کرتا۔

بھیگی ہوئی ساری عورت کے سڈول بدن سے چمٹی ہوئی تھی۔ سنیاسی نے عورت کے جسم کو اس طرح غور سے دیکھا جیسے اِس نے پہلے کبھی کسی زندہ عورت کے جسم کو نہ دیکھا تھا۔ اس طرح عورت کے جسم کو دیکھنے میں سنیاسی نے غلطی کی لیکن اُس وقت اِسے اس بات کا شعور نہ تھا۔

عورت بولی ''سوامی، میرا باپ رگھناتھ پور کا رہنے والا ہے۔ میں اپنے پتی کے ساتھ اپنے باپ کے گاؤں سے نکلی تھی۔ ہم مولپور جا رہے تھے۔ راستے میں میرے پتی رُک گئے اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں آگے بڑھتی چلوں۔ پہلے وہ میرا مذاق اُڑا رہے تھے کہ میں بہت دھیرے دھیرے چلتی ہوں اور اس دھیمی چال کے لیے انھوں نے مجھ پر طرح طرح کی مردانہ پھبتیاں کسیں کہ عورتیں اس لیے آہستہ چلتی ہیں۔۔۔۔ جب وہ رُک گئے تو میں انھیں بتانے کے لیے کہ میں کتنا جلد جلد چل سکتی ہوں۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر تیزی سے چلتی دُور نکل آئی۔

پھر کچھ دُور چلنے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھا تو ان کا پتہ نہ تھا۔ پھر میں ان کے انتظار میں وہیں سڑک پر بیٹھ گئی۔ جب بہت دیر تک انتظار کرنے پر بھی وہ نہ آئے تو میں پھر واپس مڑی اور

انھیں ہر جگہ ڈھونڈا، لیکن ان کا کہیں پتہ نہ ملا۔ میں انھیں پکارتی رہی، کوئی جواب نہ ملا۔ میں اکیلی تھی اور اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ اس راستے پر ایک گاؤں ملے گا۔ اس لیے میں ادھر چلی آئی لیکن یہاں آئی تو دیکھا کہ یہاں کوئی گاؤں نہیں ہے۔ میرے بابا مجھے آشیرواد دیجیے۔ میرے سہاگ کے لیے دُعا کیجیے۔ میرے پتی کو ڈھونڈ نکالیے کسی کو اس کی تلاش میں بھیجئے، جلدی کیجیے میرے اندر میری زندگی کانپ رہی ہے۔'' وہ بے قابو ہوئی جا رہی تھی اور ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

مرد کا دل عورت کے آنسو سے پگھل جاتا ہے۔ سنیاسی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ اُمڈ آیا۔

''ماں جی، مٹھ میں زیادہ آدمی نہیں ہیں۔ اتنی رات گئے ہم کیسے آپ کے پتی کی تلاش میں بھیج سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے آپ کے پتی پر کوئی بپتا نہ پڑی ہوگی۔ ہوا یہ ہے کہ اس موڑ پر جہاں سڑک دو الگ الگ راستوں میں بٹ گئی ہے، آپ غلط سمت مڑ گئی ہیں اور آپ کے پتی نے دوسرا راستہ پکڑا ہے۔ میرے خیال میں یہی ہوا ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں آج رات آپ یہیں ٹھہر جائیے۔ صبح کسی کو بھیج کر گاؤں میں پوچھ گچھ کریں گے۔''

عورت بولی ''بابا، میں آپ کو اپنے سگے باپ کی طرح سمجھتی ہوں لیکن مٹھ میں تو عورتیں نہیں ہیں۔ ساری رات یہاں کس طرح ٹھہر سکتی ہوں؟''

''آپ میری بیٹی کی طرح ہیں۔ اندر ایک الگ کمرہ ہے۔ آپ وہاں سو سکتی ہیں۔ میں خود آپ کے دروازے کے باہر سوؤں گا اور آپ کی حفاظت کروں گا۔ اگر رات میں آپ کو خوف محسوس ہو تو آپ مجھے آواز دے سکتی ہیں۔ گھبرائیے نہیں۔''

''آپ خود۔۔۔ہاں، آپ تو سنیاسی ہیں۔ اچھا سوامی، اب اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں نظر آتی۔ جیسا آپ کہیں میں مانوں گی صبح میں کسی کو ضرور گاؤں بھیجیے۔ میرے پتی کو ڈھونڈ نکالیے۔ میرے سہاگ کو بچائیے۔''

عورت عقیدت سے سنیاسی کے قدموں پر جھک گئی اور اپنی نرم نرم ٹھنڈی اُنگلیوں سے

اس کے پاؤں کو چھوا۔

سنیاسی جب کائنات کے حُسن دیکھتا تھا تو اس سے بھی اعلیٰ تر حُسن کا تصور کرتا تھا جو خدا کا حُسن تھا۔ کیا اب بھی وہ اسی طرح عورت کے جسم کا تھوڑا حصہ دیکھ کر عورت کے حُسن کا تصور کر رہا تھا۔ یا اس کا دھیان ویاس کے اس بیان کی طرف تھا جس میں اس نے آج ہی ترمیم کروائی تھی اور جس میں عورت کی جسمانی کشش کا تحقیر سے ذکر کیا گیا تھا؟ بہر حال۔۔۔ جب عورت کی ٹھنڈی، نرم اُنگلیاں اس کے پاؤں سے مس ہوئیں تو اس کے جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ نسوانی اُنگلیوں نے اس کے پاؤں کو بارہا چھوا تھا، لیکن کبھی اس طرح نہیں چھوا تھا۔

جب عورت اس کے پاؤں چھو کر اُٹھ کھڑی ہوئی تو اس نے اپنے ایک شاگرد کو پکار کر کہا کہ چراغ لے آئے۔ اُسے بڑی حیرت تھی کہ اس کے جسم نے عورت کے نسوانی لمس کا جواب دیا تھا۔ جب شاگرد چراغ لے آیا، عورت کو چراغ کی روشنی میں دیکھتے ہوئے سنیاسی چند ایسے احساسات سے دوچار ہوا جن سے وہ اب تک بالکل نا آشنا تھا۔

خلا کے اندھیرے میں وہ عورت ایک بجلی معلوم ہوئی تھی جیسے کوئی تنہا مسافر کالی گھٹاؤں کو دیکھتا چلا جائے اور اچانک ان کالی گھٹاؤں میں برق کی ایک تڑپتی ہوئی لکیر اس کی آنکھوں کو چندھیا دے۔ بالکل اسی طرح سنیاسی کی آنکھیں عورت کے حُسن دیکھ کر خیرہ ہو گئیں۔ سیدھی مانگ کے دونوں طرف اُس کے بال کمانوں کی صورت میں پیشانی پر جمے ہوئے تھے اور گویا ان کمانوں کے جواب میں ابروؤں کی کمانیں اُوپر تنی ہوئی تھیں، تیز، نوکیلی پلکیں خوبصورت خم کھا کر اُوپر تک چلی گئی تھیں۔ چمکیلی نیلی ساڑی، جس پر سنہری دھاریاں پڑی ہوئی تھیں، حسین تہیں بناتی اس کے سڈول بدن کے ساتھ اس طرح لپٹی ہوئی تھی کہ اس کے نسوانی جسم کے نشیب و فراز اور قوسیں پوری طرح نمایاں ہو رہی تھیں۔ وہ مسکرا نہیں رہی تھی، لیکن اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو۔۔۔ ''میں اپنے شوہر کے سوا کسی کے سامنے نہیں مسکراتی۔ پھر بھی دیکھیے یہ مسکراہٹ روکنے کے باوجود کیسے پھوٹی پڑ رہی ہے۔'' اس کے گالوں میں وہ ننھے ننھے گڑھے تھے اور یہ گڑھے اتنے پیارے، اتنے دلفریب تھے معلوم ہوتا تھا اس کے رُخساروں کے

قیامت خیز حُسن کو گرفت میں رکھنے کے لیے دو کیلیں اس کے گالوں میں ٹھونک دی گئی ہیں۔ اس کے جسم کا تناسب اس کے چہرے کے حُسن کا ساتھ دے رہا تھا اور کندنی زیورات اس کے حُسن میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ اس کے بازوؤں پر جڑاؤ، بازوبند، کلائیوں میں طلائی چوڑیاں، ناک میں ہیروں کی نازک سی کیل اور کالے بالوں میں سفید چنبیلی کے پھول اس کا ثبوت دے رہے تھے کہ سفید اور سیاہ کا امتزاج کیا حُسن پیدا کر سکتا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر سنیاسی حیران رہ گیا یہ خوبصورتی غیر معمولی خوبصورتی تھی جو کسی بھی مرد کے دل و دماغ کو گرفت میں لانے کے لیے کافی تھی۔ ایسی خوبصورتی اُس کے سامنے آج ہی کیوں آئی تھی؟

کہ یہ خوبصورتی آج ہی اس کے سامنے آئے؟ یہ بڑی حیران کن بات تھی۔ اور اسی حیرت میں سنیاسی کچھ دیر ٹکٹکی باندھے عورت کی طرف دیکھا کیا۔

عورت ہلکے سے مسکرائی اور اپنا سر جھکالیا۔ روشنی کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کسی کو میرے ساتھ بھیج دیں تو میں گاؤں چلی جاؤں گی۔"

سنیاسی کھسیانا ہو گیا۔ "میں نے چراغ اس لیے منگوایا کہ آپ کو اندر لے چلوں۔ چلیے اندر چلیں۔"

"نہیں سوامی، آپ کسی کو میرے ساتھ کر دیجیے۔ یہ بہتر ہے کہ میں اس وقت گاؤں چلی جاؤں۔"

"ماں جی، گاؤں یہاں کہاں ہے؟ اور اتنی رات گئے، آپ کیسے جا سکتی ہیں۔ آپ کی حفاظت کے لیے میں خود یہاں موجود ہوں۔ آپ کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ یہاں دیوی کی مقدس بارگاہ میں آپ کو کسی بات کا خوف نہیں۔ آیئے اندر چلی آیئے۔"

عورت اندر لائی گئی۔ اسے پہننے کے لیے ایک پُرانی ساری دی گئی جو دیوی کی مورتی کو پہنائی جاتی تھی۔ دیوی کی پوجا ہونے تک عورت وہیں کھڑی رہی۔ پھر سب نے کھانا کھایا۔ پھر ایک نوکر نے صحن سے ملے ہوئے کمرے میں ایک چٹائی بچھائی، اس پر دو ایک پُرانے کپڑے ڈالے اور عورت سے کہا کہ وہاں چل کر سو رہے۔ سنیاسی نے پھر اسے تسلی دی کہ وہ اس کے

دروازے کے باہر سوئے گا۔ خوف کی کوئی بات نہیں۔ عورت مسکرائی اور بولی ''خدا میرا محافظ ہے۔ مجھے کوئی خوف نہیں۔''

سنیاسی کمرے کے باہر بیٹھا تھا، تھوڑی دیر بعد عورت باہر آئی، سنیاسی کے پاؤں چھوئے اور پھر اندر جا کر سو رہی۔ کچھ دیر بعد پھر دروازے کے پاس آئی، باہر جھانک کر دیکھا اور سنیاسی پر ایک مشکوک نگاہ ڈال کر دروازہ بند کر لیا اور چٹخنی چڑھا دی۔

اس عورت میں کمسنی کی معصومیت بھی نہ تھی اور پختہ سن کا تجربہ بھی نہ تھا۔ یونہی جوانی کی شوخی تھی اور وہ اپنے حُسن سے آگاہ تھی۔ سنیاسی نے پہلے کبھی نسائیت کے سحر کو اس شدّت سے محسوس نہ کیا تھا۔ ممکن ہے نسائی دلکشی پہلے بھی اس کے سامنے آئی ہو لیکن اس نے کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا۔ آج اس نے یہ دیکھنا چاہا کہ نسائی، رعنائی اور دلکشی کیسی ہوتی ہے اور اس کا ذہن اس میں اُلجھ گیا۔ عورت کی حرکات، شک اور بدگمانی لیے ہوئے، اس کی عجیب نظریں۔۔۔ سنیاسی اپنی سنجیدگی بھول رہا تھا اور اس کا ذہن شوخی، شرارت اور چھیڑ چھاڑ کی جانب مائل ہو رہا تھا۔ عورت اس سے ایک ممکنہ ساتھی کا سلوک کر رہی تھی۔ جب کہ دوسری عورتیں اسے اپنا بزرگ سمجھتی تھیں۔ اور انتہائی عقیدت سے پیش آتی تھیں۔ عورت اسے گویا اپنے جوڑ کا آدمی سمجھ رہی تھی۔ کتنی عجیب سی بات ہے۔ سنیاس نے اپنے آپ سے کہا۔ اُسے ذرا سا کیوں نہ ڈرایا جائے، لطف رہے گا۔ ایک طرف سے چھیڑ چھاڑ اور شوخی دوسری طرف بھی وہی جذبات پیدا کرتی ہے۔ سنیاسی جس کا ذہن کبھی دنیوی باتوں میں اُلجھا نہ تھا، جس نے عورت کو کبھی دلچسپی کی نظر سے دیکھا نہ تھا، عورت کی جان بوجھ کر اُکسانے والی شوخی اور ایک طرح کی بدگمانی اسے بھی شوخی کی طرف مائل کر رہی تھی۔

یہ مجھے کیا ہو رہا ہے، سنیاسی نے سوچا۔ پھر وہ سنبھل کر اپنے عارفانہ مراقبہ میں کھو گیا۔

ہر روز جب وہ اس طرح اپنے مراقبہ میں محو ہوتا تھا، وہ اپنی دیوی کا تصور کیا کرتا تھا۔ اب دیوی کی صورت کے ساتھ ساتھ ایک اور صورت اس کے ذہن میں متحرک تھی۔ یہ کس کا چہرہ تھا۔ یہ اس نو وارد عورت کا چہرہ تھا۔ سنیاسی نے اپنے آپ سے پوچھا۔ یہ چہرہ میرے ذہن میں کیوں گھوم رہا ہے؟ سنیاسی نے اس سے انکار کرنا چاہا کہ وہ عورت کی طرف کھنچ گیا ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں

آخر؟ یہ فرض کیا جائے کہ عورت سے سنیاسی کی شادی ہوسکتی تھی، کیا وہ واقعی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا؟ نہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شادی کے بغیر وہ اس کی داشتہ بن سکتی تھی؟ کیا وہ یہ بات پسند کرتا تھا؟۔۔۔ نہیں؟ اس کے پاکیزہ دل میں اس قسم کی طلب اور تمنا کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ پھر وہ کیا چاہتا تھا؟۔۔۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ اس چہرے کو دیکھے، صرف ایک مرتبہ دیکھے۔ فرض کیجیے جب آپ کسی سڑک پر جارہے ہیں اور کسی کے باغیچہ میں آپ کو ایک خوبصورت گلاب اپنی ٹہنی پر جھومتا نظر آتا ہے۔ گلاب کے پھول ہیں، سفید اور گلابی رنگوں کا حسین امتزاج قرینے سے تہ بہ تہ جمی ہوئی پتیاں، آپ کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ آپ مجبور ہو کر اسے دیکھنے لگتے ہیں لیکن آپ صحن میں گھس کر گلاب توڑنا نہیں چاہتے۔ نہ آپ کا ارادہ گلاب کو اپنے پاس رکھ لینے کا ہوتا ہے۔ آپ صرف اسے ایک نظر اچھی طرح دیکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک بالکل پاکیزہ سی خواہش تھی جو اب سنیاسی کے دل میں پیدا ہورہی تھی۔ وہ صرف عورت کے چہرے کو ایک دفعہ اور اچھی طرح دیکھ لینا چاہتا تھا تاکہ اُسے پھر اس کا خیال نہ آنے پائے اور وہ بغیر کسی مزید خلل کے دیوی کے تصور میں محو ہو سکے۔ ایک طرف عورت کو دیکھنے کی تمنا تھی۔ دوسری طرف وہ ضبطِ نفس تھا جو سالہا سال کی ریاضت سے حاصل ہوا تھا اور یہ احساس کہ ایسی خواہش جائز نہیں ہے۔ دونوں کے درمیان کشمکش جاری رہی اور سنیاسی نے اس خواہش کو پرے ہٹا دیا۔ اس خیال سے کہ اس سے کوئی غیر مناسب حرکت سرزد نہ ہونے پائے، احتیاطاً اس نے اپنے ایک شاگرد کو اپنے پاس بلا لینا چاہا اور شیشا کو آواز دی۔

لیکن شیشا کو بلانے اور شیشا کے آنے کے درمیانی لمحوں میں اس کا نظریہ پھر بدل گیا۔ سنیاسی کو خوف محسوس ہوا تھا کہ کہیں عورت کو دیکھنے کی خواہش اس کے ضبطِ نفس پر حاوی نہ ہو جائے اور ایسے میں شیشا اس کے پاس ہو تو اچھا ہے لیکن پھر اسے خیال آیا۔۔۔ کیا میں اتنا کمزور ہوں؟ میں جو اب تک اتنا پاک باز رہا ہوں، آج ہار جاؤں گا؟ اگر میں اپنے آپ کے لیے راہِ راست پر نہیں رہ سکتا تو شیشا کی وجہ سے کیسے رہ سکتا ہوں؟ اس لیے سنیاسی نے یہ فیصلہ کیا کہ شیشا کو اپنے پاس رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے تحت الشعور میں دراصل کیا تھا، کون کہہ سکتا ہے؟

اگر شیشا میرے پاس آکر سوئے تو چاہے خواہش کتنی ہی شدت اختیار کر جائے۔ اسے پوری کرنے کا امکان ہی نہیں رہے گا۔ آخر اتنی سی خواہش میں کوئی بُرائی تو نہیں ہے۔ آخر عورت کو میری طرف سے کوئی خطرہ تو نہیں۔ اور نہ میری اپنی پاک دامنی کو کوئی خطرہ ہے۔ میں تو صرف ایک بار اس کے خوبصورت چہرے کو اس کی رعنائی کو دیکھنا چاہتا ہوں، دن کی روشنی میں اسے دیکھنا مناسب نہیں، جب دوسرے لوگ موجود ہوں گے اور جب وہ خود جاگ رہی ہوگی، کیا سنیاسی کے تحت الشعور میں یہ مبہم احساسات تھے؟ بہر حال اس کا شاگرد اس کی آواز سُن کر آ گیا تھا اور سنیاسی نے اس سے کہہ دیا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہ واپس چلا جائے۔

جب سنیاسی نے اپنے آپ سے یہ پوچھا تھا کہ راہ راست پر چلنے کے لیے وہ صرف اپنی اچھائی پر اعتبار کرے یا اپنے چال چلن کی راستی پر بجا ناز کی بھی اُسے ضرورت پڑے گی اور پھر اس نے اس مدد کو ٹھکرا دیا تھا اور ٹھکرانے میں اس نے ایک غیر دانشمندانہ قدم اُٹھایا تھا۔ اس ایک پاؤں کے لنگڑے آدمی کی طرح جو اپنی بیساکیاں پھینک کر بالکل بے بس ہو جائے کیونکہ آخر یہ بیساکھیاں ہی اسے چلنے میں مدد دیتی تھیں۔ جیسے جیسے لمحات گزرتے گئے اس کی خواہش گہری ہوتی گئی۔ جب آپ ایک شفاف چشمے کے پاس بیٹھے ہوں اور پاس کے درخت کی ایک شاخ کا سایہ اس میں پڑ رہا ہو اور آپ اس سایہ کو دیکھتے رہتے ہوں اور اچانک ایک سیاہ سانپ اندر سے نکل آئے اور اس سایہ کی جگہ لے لے تو آپ خوف کھائیں گے۔ وہ ہلکا سا اضطراب، جو عورت کو دیکھ کر سنیاسی نے شام میں محسوس کیا تھا۔ رات گہری ہونے پر ایک شدید اور ملوث طلب کی صورت اختیار کر گیا۔ سنیاسی کو بار بار اس جوان عورت کے چہرے کا خیال آنے لگا۔ آغاز شب کے سارے واقعات ایک ایک کر کے اس کے ذہن کے سامنے آتے رہے۔ جب رات کی تاریکی نے دھرتی کو اس طرح ڈھانپ لیا تھا، جیسے کوئی ماں اپنی گود میں سوتے ہوئے بچے پر اپنی ساڑھی کا آنچل اڑھا دے۔ دُور گاؤں میں اَن گنت ٹمٹماتے ہوئے چراغ جیسے روشنی کے دیوتا نے اپنی ہنسی کو کئی ننھی ننھی روشنیوں میں تقسیم کر لیا ہے، تا کہ گھر گھر روشنی ہو جائے، جوان عورت کے پائل کی جھنکار، جس نے ہلکی ہلکی لہروں کی طرح شام کے امن و سکون کے سمندر کو چھیڑ دیا تھا۔ چراغ کی روشنی میں

وہ حُسن، یہ جاننے پر کہ اسے اجنبی مردوں کے درمیان تنہا رات گزارنی ہوگی، عورت کی آواز میں وہ ہلکی سی جھجک اور گھبراہٹ، اس کی وہ نظر جس میں کچھ خوف سا تھا، کچھ شرم سی تھی۔ اور شاید جسمانی طلب کا اظہار بھی، اس کی اداؤں میں، اس کے اشاروں میں اس کی چھوٹی سے چھوٹی حرکتوں میں وہ بلا کی رعنائی، ایک ساتھ ان سب باتوں نے مل کر سنیاسی کو وارفتہ بنا دیا۔ سنیاسی اس احساس سے گھبرا گیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے دیوی کے تصور میں اپنا دھیان لگانا چاہا لیکن اس کوشش میں ناکام رہا۔ عورت کو ایک بار، صرف ایک بار، اور دیکھنے کی تمنا، بھوک اور پیاس کی طرح ایک جسمانی طلب بن گئی۔

آپ پوچھیں گے آخر اس عورت میں ایسا کون غیر معمولی حُسن تھا؟ عورت کا حُسن دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک حُسن شفیق، متین، باوقار اور پُرسکون ہوتا ہے۔ یہ دل کو فتح کر لیتا ہے ساتھ ہی دل کو سکون پہنچاتا ہے، اطمینان بخشتا ہے، یہ حُسن ماں کا حُسن ہے۔ دوسرا حُسن ذہن میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے، حواس باختہ کر دیتا ہے، یہ حُسن محبوبہ کا حُسن ہے۔ ہر مرد ہر عورت میں دونوں طرح کا حُسن دیکھ سکتا ہے، بہت سے مرد جو عورت کو احترام اور عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں، کسی عورت کے حُسن میں محبوبہ کے حُسن کے بجائے ماں کے حُسن کا جزو دیکھتے ہیں۔ روایات اور اخلاقی قدروں نے اسے ان میں ایک ثانوی جبلت بنا دیا ہے، کہ وہ ہر عورت کو اس نظر سے دیکھیں، لیکن جب کوئی عورت کسی مرد کے سامنے یوں آجائے جیسے ترغیب خود مجسم ہو کر آ گئی ہو، تو پھر کوئی کیا کر سکتا ہے؟ مرد کی ہمت جواب دے جائے گی۔ وہ ہار جائے گا۔ آج سنیاسی کا دماغ بھی اُسی طرح ہار گیا تھا۔

سنیاسی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ عورت کو جگا کر صرف ایک بار اسے دیکھے گا۔ دروازے کے پاس جا کر اس نے کواڑ دھکیلا لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دروازے پر کان لگا کر سُنا۔ گہری نیند میں عورت کی لمبی گہری سانسیں اسے سُنائی دیں۔ گہری نیند کے سکون میں وہ چہرہ کتنا حسین لگ رہا ہوگا! سنیاسی کے ذہن نے سوچا، اس نے پھر دروازہ دھکیلا۔ کمرے میں کسی کے حرکت کرنے کی آواز آئی، پھر اندر سے یہ سوال پوچھا گیا۔ کون ہے؟

''میں ہوں۔''

''مٹھ کے سوامی جی؟''

''ہاں۔''

''بابا، کیا میرے پتی آ گئے ہیں؟''

''نہیں، ماں، میں صرف یہ دیکھنے آیا ہوں کہ آپ آرام سے سو رہی ہیں یا نہیں؟''

''آپ کا شکریہ۔''

''نیند تو خوب آئی ہوگی؟''

''ہاں، میرے لیے تو آپ کے اس جگانے سے نیند ہی بھلی تھی۔ کیونکہ نیند میں، میں خواب دیکھ رہی تھی، کہ میں اپنے پتی کے ساتھ سفر کر رہی ہوں۔''

''یہ اچھا شگون ہے۔ اب آپ کو کوئی خوف تو نہیں رہا؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔''

''کیا آپ نے اندر سے چٹخنی لگائی ہے؟''

''ہاں بابا، میں اکیلی عورت ہوں۔ میں نے اپنی حفاظت کے لیے اندر سے چٹخنی لگائی ہے۔''

''یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ کو ہم پر کسی طرح کا گمان ہو۔ پھر بھی آپ نے دروازہ نہیں کھولا، حالانکہ میں اتنی دیر سے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔''

''سوامی، آپ سنیاسی ہیں۔ آپ ان باتوں کو سمجھ نہیں سکتے۔ میں اکیلی عورت ہوں۔ آدھی رات کو میں اپنے پتی کے سوا کسی کے لیے بھی دروازہ نہیں کھول سکتی۔''

''ایک سنیاسی سے تو کوئی خطرہ نہیں۔''

''میں باور کرتی ہوں، کہ آپ کچھ نہیں کریں گے۔ پھر بھی یہ مناسب نہیں ہے۔ میں سوتی سوتی ابھی اُٹھی ہوں، میرے کپڑے بے ترتیب ہیں۔''

''میں آپ کو اس کا ثبوت دینا چاہتا ہوں کہ دروازہ کھولنے پر میں کچھ نہیں کروں گا۔

آپ دروازہ کھولیں تو سہی۔"

"مجھے آپ کی پاکبازی پر بھروسہ ہے۔ یہ باور کرانے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے، آپ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"آپ میری مہمان ہیں۔ کیا یہ میرا فرض نہیں کہ میں آپ کی خیر خیریت دریافت کروں؟"

آپ کی عنایت سے میں بالکل اچھی ہوں۔ میرے بارے میں کوئی فکر نہ کیجیے۔ اتنی رات گئے میں کسی اور غیر مرد سے ہرگز بات نہ کرتی۔ میں صرف آپ سے بات کر رہی ہوں۔ اب آپ جائیے، آرام کیجیے۔"

"تو آپ دروازہ نہیں کھولیں گی؟"

"نہیں۔ اپنے پتی اور صرف اپنے پتی کے لیے دروازہ کھولوں گی۔ کسی اور کے لیے ہرگز نہیں، خواہ وہ کتنا ہی دانشور، کتنا ہی سن رسیدہ، کتنا ہی پرہیز گار کیوں نہ ہو۔"

ان الفاظ نے سنیاسی کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے اپنے حواس جمع کرتے ہوئے پوچھا۔ "آپ یہ عبارت جانتی ہیں؟"

"یہ میرے اپنے الفاظ ہیں۔"

"آپ مذاق کر رہی ہیں۔ آپ بھی بڑی عجیب خاتون ہیں۔ ابھی شوخی، ابھی جفا، میں ابھی آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ جس نے یہ الفاظ لکھے ہیں وہ حقیقت سے بے خبر تھا۔ آپ دروازہ کھولیے۔ میں آپ کو بتا دوں گا کہ ایک سچا سنیاسی کبھی بھی ایسی کمزوری کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔"

"آپ جو کچھ بھی کہیے، میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

"اگر میں زبردستی کھول دوں تو؟"

"اچھا کھولیے اور سبق حاصل کیجیے۔"

سنیاسی ایک لحہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر "بہت اچھا" کہہ کر اس نے کواڑ دھکیلے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اندر سے چٹخنی نہیں لگائی گئی تھی۔ چونکہ ذرا سا دباؤ ڈالنے پر دروازہ کھل گیا۔ سنیاسی نے اندر

قدم رکھا۔ اس نے اپنے سامنے عورت کو نہیں، بلکہ ایک مردِ بزرگ کو کھڑا ہوا پایا۔ ان بزرگ کی لمبی لمبی جٹائیں تھیں اور ہونٹوں پر ایک عجیب مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ سنیاسی چونک پڑا پھر شرم سے اس نے سر جھکا لیا۔

بزرگ نے کہا۔ ''اگر ذہن اس طرف کھنچا نہ تھا تو آخر اسے دیکھنے کی اتنی تمنا کیوں تھی؟''

سنیاسی بزرگ کے پاؤں پر گر پڑا۔ ''میں نے بے وقوفی کی۔ معاف فرمایئے۔''

''تمہارا خیال تھا میں حقیقت کو نہیں جانتا۔ خیر یہ کوئی بات نہ تھی کیونکہ تم مجھے جانتے نہ تھے لیکن خود اپنے اُستاد اور گرو کی بات بھی تم نے قبول نہ کی۔''

''مجھ سے بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی۔''

''تو اس کے سامنے سر جھکاؤ۔''

سنیاسی نے سر اُٹھایا اور ویاس کے پہلو میں اپنے گرو کو کھڑے دیکھا۔ گرو کی آنکھوں میں اپنے چیلے کے لیے شفقت تھی اور وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اپنے چیلے کی اس لغزش نے اسے محظوظ کیا ہو۔ سنیاسی نے اپنے گرو کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔

پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا کہ وہ ان دونوں بزرگوں سے بات کرے لیکن انھیں غائب پایا۔ جس جگہ پر وہ دونوں کھڑے تھے، شام والی عورت فرش پر سو رہی تھی۔ اسے دیکھنے کی یا اس کے خوب صورت خد و خال کا تصور کرنے کی، سنیاسی کے دل میں اب کوئی خواہش نہ تھی۔ سنیاسی پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ وہ آج رات کے تجربوں سے اس لیے گزارا گیا تھا، تا کہ وہ خود اپنے آپ کو پہچان سکے۔

سنیاسی دروازہ بند کر کے باہر آیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ کر وہ پھر دیوی کے تصور میں محو ہو گیا اور اب اس کا ذہن بغیر کسی خلل کے دیوی کی طرف لگا رہا۔ وہ رات بھر یونہی بیٹھا رہا۔

جب دوسرا دن طلوع ہوا اور دُنیا کے طور دیکھنے کے لیے سورج پھر اُبھر آیا، مٹھ کے نوکر چاکر اور شاگرد سب جاگ پڑے اور اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ تو شام میں آئی ہوئی عورت کا شوہر اسے ڈھونڈتے ہوئے مٹھ آ پہنچا تھا اور وہ دونوں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

جانے سے پہلے وہ دونوں سنیاسی کے پاس آئے۔ دونوں نے جھک کر عقیدت سے اس کے پاؤں چھوئے۔ عورت نے کہا ''بابا جب میں مصیبت زدہ تھی، بے بس تھی، آپ نے مجھے پناہ دی۔ میری عزت آبرو کی حفاظت کی۔''

سنیاسی نے کہا ''ماں، خدا نے آپ کی حفاظت کی۔ آپ کی بھی اور میری بھی۔'' قدرے توقف کے بعد سنیاسی نے پھر کہا۔ ''میں رات آپ کے کمرے میں آیا تھا، آپ اطمینان سے سو رہی تھیں۔''

''مجھے اس کی بالکل خبر نہیں۔ آپ کی نگرانی میں، میں اپنے آپ کو بالکل محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ جیسے ہی بچھونے پر پڑی، ایسے سوئی کہ کسی بات کی خبر ہی نہ رہی۔ اب صبح ہونے پر میری آنکھ کھلی، مجھے بالکل پتہ نہ چلا کہ رات آپ میرے کمرے میں آئے تھے۔ جب میں جاگی تو دیکھا کہ دروازہ کی چٹخنی نہیں لگی ہے۔ میں نے سوچا رات شاید میں نے بھولے سے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔''

''نہیں ماں، آپ نے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے دھکیل کر اسے کھولا تھا۔''

سنیاسی نے میاں بیوی سے کہا کہ وہ صبح کا ناشتہ یہیں کر لیں اور ان دونوں نے اسے منظور کر لیا۔ پوجا پاٹ میں وہ بھی شریک ہوئے اور جب پرشاد بانٹا گیا تو انھیں بھی ملا۔ سنیاسی نے آج صبح اس عورت میں وہ شوخی، وہ دلربائی بالکل نہیں پائی جس نے کل شام اس کے دماغ کو گرفت میں لے لیا۔

دوپہر میں جب مہمان چلے گئے اور سنیاسی حسبِ معمول شیشا کو پڑھانے بیٹھا تو اس نے شیشا سے کہا کہ وہ دیا س کے بیان کو پھر اپنی اصل کے مطابق لکھ دے۔ اُس کے شاگرد نے پھر سے تصحیح کر دی اور پوچھا ''بزرگ و برتر اُستاد، کیا شاردما نے آپ کو اس کا حکم دیا؟''

''یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''جب شاردما کل رات یہاں آئی تھیں تو میں پہچان گیا کہ یہ وہی ہیں۔ یہ بات آپ نے مجھے نہیں بتائی تو میں نے سوچا شاید آپ کا منشا یہ ہے کہ ہم سب لوگ انھیں کوئی عام عورت سمجھ

لیں۔ جب آدھی رات میں آپ نے مجھے پکارا تو میں نے خیال کیا آپ دیوی شاردمما کے حضور میں جا رہے ہیں اور از راہِ عنایت آپ نے مجھے بھی بلوایا ہے کہ میں بھی دیوی کے درشن کرلوں۔ لیکن جب میں آپ کے پاس آیا تو آپ نے مجھے پھر واپس بھیج دیا۔ غالباً آپ نے خیال کیا کہ میں ابھی اس قابل نہیں ہوں، رُوحانی ارتقا کی اُس آخری منزل پر نہیں پہنچا ہوں کہ میں دیوی کا جلوہ کرسکوں۔ میں واپس آ گیا لیکن سامنے دالان میں بیٹھا رہا کہ شاید پھر آپ مجھے بلائیں۔ جب آپ کمرے کے باہر کھڑے دیوی سے باتیں کررہے تھے تو مجھ پر ایک طرح کی غنودگی سی طاری ہوگئی۔ اس کے باوجود مجھے محسوس ہوا کہ آپ کمرے کے اندر گئے ہیں اور اندر کسی سے باتیں کررہے ہیں۔ صبح اُٹھا تو میں نے جان لیا کہ آپ مجھے دیوی کے حضور میں اس لیے نہیں لے گئے کہ میں اس تجربہ کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اب آپ نے ویاس کے بیان کو اپنی اصلی شکل دینے کے لیے کہا تو مجھے خیال ہوا۔ شاید کل رات دیوی نے آپ کو ساری حقیقت سمجھائی ہے کہ ویاس کا بیان سچا ہے۔"

"تو تمہارا خیال ہے کہ وہ عورت جو ابھی یہاں سے گئی دیوی شاردمما تھی؟"

"نہیں حضور، وہ جو کل شام آئی تھیں، دیوی شاردمما تھیں۔ یہ عورت جو اب یہاں سے گئی، یہ کوئی اور ہے۔"

"تو پھر اس عورت کا کیا ہوا جو کل رات آئی تھی۔ اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"یہ سب میں کیا جانوں حضور۔ آپ اپنی رُوحانیت کے بل پر سینکڑوں کرامتیں دِکھا سکتے ہیں۔ میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکوں گا۔ آپ نے از راہِ عنایت مجھے اتنی آگاہی دی کہ دیوی شاردمما کو پہچان سکوں اور میں نے پہچان لیا۔ اب آپ مجھے اس سے زیادہ بتانا نہیں چاہتے تو میں آپ کے بتائے بغیر کیسے جان سکتا ہوں؟ اس سے مجھے ٹھیس بھی نہیں پہنچی کیونکہ میں جانتا ہوں خواہ آپ مجھے کچھ بتائیں یا مجھ سے کچھ چھپائیں، ہر حال میں آپ میری بھلائی ہی چاہتے ہیں۔"

سنیاسی اپنے چیلے کی اس گہری محبت اور اعتقاد سے بہت متاثر ہوا۔ اُسے اس معصومیت پر رشک آیا جس نے الوہی حُسن کا جلوہ دیکھا، جبکہ خود اُسے محض فانی حُسن نظر آیا۔ اُس نے کہا

''شیشا، میرے بچّے! تم جس حال میں ہو وہ مجھ سے بہتر ہے۔ خدا تم پر ہمیشہ ہمیشہ فضل کرے۔ تم نے دیوی کا رُوپ دیکھ لیا، جہاں میں نے صرف عورت دیکھی۔'' اور پھر اس نے اپنے شاگرد کو شام سے اب تک کے واقعات تفصیل سے بتائے اور کوئی بات پوشیدہ نہ رکھی۔

اپنی ساری بپتا سُنا کر سنیاسی نے اپنے چیلے سے کہا ''یہ باتیں تم اچھی طرح یاد رکھ لو۔ اور انھیں دوسروں کو بھی سُنا دو۔ جو رُوحانی ہدایت حاصل کرنے یہاں چلے آتے ہیں۔ تم اس کا بالکل لحاظ نہ کرنا کہ میری کہانی بیان کرنے سے میری نیک نامی پر کوئی دھبہ آئے گا، جو کچھ مجھ پر گزرا اسے میں شرم کا باعث نہیں سمجھتا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ خدا نے مجھے اس گڑھے میں گرنے سے بچا لیا، جس کے کنارے میں کل شام اپنے فخر کے سہارے چلتا پہنچ گیا تھا۔ یہ خدا ہی ہے جو انسان کو سیدھے راستے پر چلاتا ہے۔ انسان خود اپنے سہارے اس پر چل نہیں سکتا۔ نیکی اور فخر ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ انسان کو بے جا فخر نہیں کرنا چاہیے۔''

''میرے دوست، بنیادی اصلی اور ازلی حُسن خدا کا حُسن ہے۔ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق یہ حُسن ہم سب کو مسحور کرتا ہے۔ کوئی اس کے مجازی مظہر ہی کو دیکھ پاتا ہے، کوئی حقیقت کی تلاش میں رُوحانی ارتقا حاصل کر لیتا ہے۔ بہر حال یہاں بھی اور وہاں بھی یہ خدا ہی کا جلوہ ہے جو ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ کشش خدا کی کشش ہے۔ حُسن کو دیکھ کر ہمیں خدا کے حُسن کا تصور کرنا چاہیے۔ سارا حُسن اور ساری نیکی خدا کی طرف سے ہے۔ کائنات کے ہر ذرّے میں خدا کا جلوہ ہے۔''

گھر تک

(ماستی وِنکٹیش آئینگار)

"لنگا"

"سوامی"

ہم راستہ بھول گئے ہیں لیکن میرا خیال ہے، ہمارا گاؤں یہاں سے قریب ہی ہے۔

"اِدھر دیکھیے سوامی۔ سفید لکیر دِکھائی دے رہی ہے نا، وہی ہوگی سڑک۔ نہیں وہ تو پانی بہہ رہا ہے۔ ایک چھوٹا سا نالا۔"

"اِدھر آ، اس ٹیلے پر چڑھ کر دیکھیں۔ شاید کچھ پتہ چلے۔"

ہم چڑھنے لگے۔ لنگا بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔ پاؤں کیچڑ میں دھنس جاتے۔ میں اس کے پیچھے گھوڑے پر ہولیا۔ اندھیرا ہو چلا تھا ہلکی ہلکی بونداباندی ہو رہی تھی۔ گرمی کی چھٹیوں میں، میں اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ بنگلور سے بس میں چلا۔ تحصیل پہنچ کر وہاں شیخ داد صاحب سے جن سے میری جان پہچان تھی، گھوڑا لیا اور ان کے نوکر لنگا کو ساتھ لیے چلا تھا۔ لنگا راستے سے اچھی طرح واقف نہ تھا، لیکن میں اِدھر سے کئی دفعہ گزرا ہوں۔ جانے کیسے ہم اس شام بھٹک گئے۔

"لنگا"

"جی سوامی۔"

"سوٹ کیس کا بوجھ زیادہ تو نہیں معلوم ہو رہا؟"

"جی نہیں بہت ہلکا ہے یہ۔ دیکھنے میں بڑا معلوم ہوتا ہے بس۔ کیا رکھا ہے سوامی اس میں؟" "بس چند کتابیں، دو جوڑے کپڑے، بھائی کے لیے زری کی ٹوپی اور جوتے، بہن کے لیے دو گڑیاں۔ بس یہی۔"

"بنگلور میں آپ کے دن رہے سوامی؟"

''پچھلی گرمیوں کے بعد اب لوٹ رہا ہوں۔ دیکھا ایک سال میں یہ جگہ اتنی بدل گئی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف جھاڑیاں اور پودے بھی بدل گئے ہیں۔ اسی لیے تو سمجھ میں نہیں آرہا کس سمت جا رہے ہیں۔''

ہم تینوں، لنگا، میں اور گھوڑا تھک کر چُور ہو رہے تھے۔ کچھ دیر خاموشی سے یونہی چلتے رہے۔ مجھے گھر جلدی پہنچنے کی بے تابی تھی۔ میں ماں سے ملنا چاہتا تھا، ننھے کو دیکھنا چاہتا تھا جو ٹوپی کا انتظار کر رہا ہوگا۔ پتا جی کو سنانا چاہتا تھا کہ میں نے امتحان میں پرچے کتنے اچھے کیے ہیں اور بھی کتنی ساری باتیں تھیں جو گھر والوں کو سُنانی تھیں......''

ہم چڑھائی پر چڑھ کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ لیکن بے سود۔ راستہ سُجھائی نہیں دے رہا تھا۔ صبح راستہ معلوم کرنے کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے میں نے سگریٹ جلانے کی کوشش کی۔ ہوا اتنی تیز تھی۔ دیا سلائی بُجھ بُجھ جاتی۔ آخر بڑی مشکل سے سگریٹ جلایا۔

سُناٹا، ویرانی اور ہوا کی سائیں سائیں۔

ہمیں ساری رات یہیں پڑا رہنا ہوگا۔ اس بیابان میں۔

گھوڑا جیسے میری بات سمجھ گیا، اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

لنگا بولا۔ ''ذرا سُنیے سرکار۔''

ہماری داہنی جانب کتے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے کہا ''چل اسی طرف چلیں، شاید کوئی گاؤں مل جائے۔ پیڑ پودوں کو دیکھتے چلیں، کچھ نہ کچھ نشان مل جائے گا۔''

ہم ذرا داہنے کو مڑ کر اُترنے لگے لیکن کتے کا بھونکنا پھر سُنائی نہ پڑا۔ لنگا یکا یک رُک گیا۔

''وہ......وہ دیکھیے ادھر۔''

میں نے دیکھا جدھر اس نے اشارہ کیا تھا۔ ''اوہ! وہ تو ایک پیڑ ہے۔ ڈرپوک کہیں کا، اودھر آجا۔ گھوڑے کے ساتھ چل، گھبرائیں میں تجھے ایک کہانی سُناؤں گا۔ تجھے پڑھنا لکھنا آتا ہے کیا؟''

''کچھ کچھ آتا ہے، سوامی، اچھا سُنائیے کہانی۔''

وہیں ایک مینڈھ پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں لنگا کو کہانی سُنانے لگا۔

انگریزی فوج کاویری ندی پار کر کے کیسے آئی...... کھڑی دوپہر میں انگریز قلعے پر چڑھ آئے اور اس پر اپنا جھنڈا چڑھادیا...... اس وقت سلطان ٹیپو، کھانے پر بیٹھے تھے۔ دونوالے ہی لے پائے تھے کہ انگریزوں کی چڑھائی کی خبر سُنی۔ کھانا چھوڑا، اُٹھ کھڑے ہوئے۔ گھوڑے پر سوار ہو کر قلعے کے پاس آئے...... شام تک ڈٹ کر لڑتے رہے۔ سات گولیاں کھائیں۔ پھر بھی جان باقی تھی۔ وہ لاشوں میں چھپے پڑے تھے۔ ایک گورے نے ٹیپو کا کمر بند نکالنا چاہا۔ ٹیپو نے تلوار کا وار کیا۔ سپاہی نے گولی چلائی۔ اس گولی سے وہ ختم ہو گئے...... پھر کہانی کا بقیہ حصہ انگریزوں کا سلطان کے بیٹوں کو قید کرنا۔ لالٹین لے کر ٹیپو کی لاش تلاش کرنا۔۔۔ رات کی تاریکی میں سرینگپٹن میں لوٹ مار...... ہراساں عورتوں اور بچوں کا رات سڑکوں پر گزارنا، دوسری صبح ٹیپو کے جنازے کا جلوس، تجہیز و تکفین .... اور پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا......

"بڑی دُکھ بھری کہانی ہے سوامی، سچ کتنی دُکھ بھری ہے۔"

ہم پھر چل پڑے۔ پیڑ کی طرف دیکھتے ہوئے لنگا نے زیرلب کہا۔ "سوامی، پیڑ کہیں ایسا ہوتا ہے؟" اور گھوڑے کے نزدیک آ گیا۔

بات بھی یہ تھی کہ وہ پیڑ تاریکی میں کچھ بھیانک سا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ سوچ کر لڑکا ڈر جائے گا، میں گھوڑے سے نیچے اُتر پڑا۔

"اس پیڑ کو میں اچھی طرح جانتا ہوں، رے ہمارا گاؤں یہاں سے بالکل قریب ہے۔ اسی پیڑ کو دیکھ کر میرا بھائی شامنا، ڈر گیا تھا۔"

"وہ اس طرف کیوں نکل آئے تھے، سرکار؟"

"پچھلی گرمیوں میں جب یہاں آیا تھا۔ شامنا اور میں شام میں یونہی گھومنے نکلے۔ اس وقت اس کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔ وہ مجھے ایک کہانی سُنا رہا تھا۔ وہی کہانی جو ابھی میں نے سُنائی۔ وہ اتنے جوش و خروش میں ہوتا کہ کہانی سُناتے اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ شامنا بڑا ہوشیار ہے۔ بڑی اچھی کہانیاں سُناتا ہے۔ سرینگپٹن کی کہانی اسے بہت پسند ہے۔ وہ مجھے تنگ کیا کرتا ہے مجھے سرینگپٹن لے چلو۔ اس دن بھی کہانی سُنتے سُنتے رات ہو گئی اور ہم راستہ بھول گئے اور بھٹک

کر اسی پیڑ کے پاس پہنچے۔ شامنا اس پیڑ کو دیکھ کر ڈر گیا۔ پھر گھر پہنچتے ہی اس کو بخار چڑھ آیا اور تین دن تک نہ اُترا۔"

''تب تو یہاں سے گاؤں جانے کا راستہ آپ کو معلوم ہوگا۔۔۔۔ یہاں سے گاؤں اور کتنی دُور ہے؟''

''یہاں سے گاؤں تک کوئی سیدھی سڑک نہیں۔ ہمیں اندھیرے میں کھوج لگاتے جانا ہوگا۔ یہاں سے گاؤں کوئی آدھ میل ہوگا۔ یہ ہمارے گاؤں کا شمشان ہے۔"

''کیا کہا سوامی؟''

ارے توبہ، میں نے بھول کر شمشان کا ذکر اس کے سامنے کر دیا۔ یہ چودہ سال کا لڑکا پھر ڈر جائے تو۔

''بس اب گاؤں آ ہی گیا۔ یہاں سے ذرا داہنی طرف جانا ہے۔ یہ پیڑ ہمارے گاؤں کے پچھم میں ہے۔''

بارش تھم گئی تھی لیکن تاریکی بڑھ گئی تھی۔ لنگا پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ میں جان گیا وہ ڈر گیا ہے۔ اس سے بات کرتے رہنا چاہیے، میں نے سوچا۔

''لنگا!''

''اِدھر دیکھیے'' اس نے اُنگلی سے پیچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بھوتوں سے ڈرتا ہے بزدل، ڈرپوک کہیں کا!''

''لیکن وہاں سوامی، دیکھیے اُدھر۔۔۔'' وہ اصرار کر رہا تھا۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مینڈھ کے پاس جہاں بیٹھ کر میں نے لنگا کو کہانی سُنائی تھی، روشنی نظر آئی اور دو شکلیں آمنے سامنے بیٹھی زمین کی طرف تک رہی تھیں۔ جھوٹ کیوں کہوں؟ مجھے بھی ذرا ڈر لگا۔

''لنگا تجھے کیا دِکھائی پڑتا ہے وہاں۔''

''دیکھیے۔ ایک مشعل ہے اور اس کے پاس۔۔۔''

''ڈرمت، چل پاس جا کر دیکھیں۔''

''دیکھیے اس طرف، دیکھیے۔'' وہ بے حد سہا ہوا تھا۔

روشنی اب حرکت کرتی نظر آئی۔ میں نے لنگا کا ہاتھ تھام لیا اور دوسرے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام پکڑے میں دھیرے دھیرے مینڈھ کی طرف بڑھا۔ جو کچھ نظر آیا تھا وہ ہمارا وہم نہیں تھا۔ دو صورتیں واقعی تھیں اور وہ بات کر رہی تھیں۔ انسانی آواز سُن کر ہم میں ہمت آئی اور ہم پیڑ کے پیچھے کھڑے ہو کر سُننے لگے۔

''ہائے، میرے بچے، میرے لال، تُو پیاس سے تڑپتا رہا۔ تیرے لیے دودھ لائی ہوں، لے پی لے...... کیسا تھا میرا لال، اور اب تو سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا...... ہم سب کو چھوڑ کر کہاں چلا گیا تو...... آخر وقت تُو کیا کہنا چاہتا تھا، میرے بچے، تیرے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے، تیری آنکھیں، تیری آنکھوں میں کتنا کرب تھا! تیری آنکھیں کہتی تھیں تُو ہمیں چھوڑنا نہیں چاہتا، ہائے، میرے بچے، اس جنگل بیابان میں اکیلا تن تنہا، ہائے بھگوان کیا یہ سب سچ ہے؟''...... ایک عورت کٹورے سے مینڈھ پر دودھ اُنڈیل کر زار و قطار رو رہی تھی، بین کر رہی تھی۔ ہم اس دھیمی روشنی میں پہچان سکتے تھے کہ وہاں دو عورتیں ہیں، ان میں سے ایک چھوٹی لڑکی ہے۔ لڑکی رو رو کر کہہ رہی تھی۔

''ہم بھیا کو لکھ بھی نہ سکے۔ دو دن کے اندر ہی یہ کیا ہو گیا۔ ہائے۔''

میں نے چند قدم آگے بڑھائے۔ اتنے میں ہمارے سامنے کی روشنی مینڈھ میں پہنچ گئی......

پھر تیسری آواز آئی۔ بھرائی ہوئی لیکن قدرے کرخت۔

''یہ کیا پاگل پن ہے کہ ایسی خوفناک رات میں تم یہاں آئی ہو۔ کیا تمھارے رونے چلانے ...... سے وہ واپس آ جائے گا؟''

میں نے آواز پہچان لی۔ یہ میرے پتا جی کی آواز تھی۔

''میرے بچے، تُو اندھیرے سے ڈرتا تھا، اب اندھیرے میں اکیلا پڑا ہے۔ تُو ایک بار اسی جگہ ڈر گیا تھا۔ اور اب تُو اکیلا اسی جگہ پڑا ہے، اب تجھے ڈر نہیں لگتا؟ میں تجھے اکیلا چھوڑ کر گھر کیسے جاؤں۔'' میری ماں پھر پھوٹ پڑی۔

''بھیا ٹوپی اور جوتے لائیں گے۔ اب انھیں سرینکپٹن کا قصہ کون سُنائے گا۔ بھیا کس کو سرینکپٹن دِکھائیں گے۔ شیامو، میرے شیامو، ہائے بھگوان۔'' یہ میری بہن تھی۔

اس وقت مجھ پر کیا گزر رہی تھی میں بیان نہیں کر سکتا۔ ایسا لگتا تھا کائنات کی اس بے کراں وسعت میں، میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ لگا میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا تھا، مجھے وہاں جانے سے روک رہا تھا لیکن میں ہاتھ چھڑا کر مینڈھ کی طرف بھاگا۔

پتا جی نے لالٹین اُوپر اُٹھائی اور پوچھا ''کون ہے؟''

مجھے دیکھتے ہی سب پھر پھوٹ پڑے۔ نئے سرے سے کرب، ان کے سینوں میں اُمڈ آیا، میں بہت دیر تک شامنا کی قبر پر آنسو بہاتا رہا۔ میں نے سوٹ کیس سے ٹوپی اور جوتے نکالے اور انھیں شامنا کی قبر پر رکھ دیا۔ شامنا نے ایک بار پوچھا تھا۔ ''بھیا یہ پیڑ پودے جنگل میں اکیلے کیسے رہتے ہیں؟'' میرا جی چاہا ساری رات یہیں گزار دوں، شامنا کو اکیلا نہ چھوڑوں۔

ہم بہت دیر تک وہاں رہے۔ شامنا کی باتیں کرتے رہے۔ اس کی بیماری، اس کی موت...... وہ ہمارے گھر کا ہیرا تھا، سب گاؤں والوں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ سب کا چہیتا، ذہین، عقل مند، اب اس کے بغیر زندگی بے کیف تھی۔

پتا جی نے آہ بھر کر کہا ''ایک نہ ایک دن، ہم سب کو یہیں آنا ہوگا۔''

ہوا کا ایک جھونکا جیسے اپنے ساتھ اس کا جواب لایا۔ ''ہاں''

میرا بھائی اسی جگہ جہاں وہ ڈر گیا تھا، آج اکیلا، ابدی نیند سو رہا تھا۔ اسے چھوڑ کر ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ جی ہاں گھر کی طرف؟ لیکن ہمارا گھر ہے کون سا؟
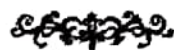
مشرق و مغرب
کی کہانیاں

مشرق و مغرب کی کہانیاں
مترجم: ممتاز شیریں
BOOKS GIVE US WINGS
NATIONAL BOOK FOUNDATION